الرسالہ
Al-Risāla

November 2003 • No. 324 • Rs. 10

جتنا عمل اتنا انعام — یہی دنیا کا قانون ہے اور یہی آخرت کا قانون بھی۔



THE IDEOLOGY OF PEACE

THE IDEOLOGY OF
PEACE

TOWARDS A
CULTURE OF PEACE



MAULANA WAHIDUDDIN KHAN

PEACE, always desirable for its own sake, has been vital to human progress in every age. The difference now in this nuclear age is that it has literally become a matter of life and death for humanity. Peace means life: its absence leaves no hope of human survival.

The author sees the establishment of peace, the very antithesis of nuclear destruction, as an opening of life's doors to every possible opportunity for positive action. It may be compared to the removal of a dam from a river. Life, like a flowing river, surges onwards, constantly propelled by human nature and coming to a halt only when the artificial barriers of war and violence are placed before it. Peace, unlike war, creates conditions that enable us to work towards constructive ends and to strive for justice unhindered. Indeed, it gives the greatest possible stimulus to the flow of beneficent human activity.

ISBN 81-7898-129-7 RS. 130

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ، نومبر 2003

امریکا کا سفر



الرسالہ

Al-Risala

، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خان

صدر اسلامی مرکز

Al-Risāla

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-13
Tel. 2435 6666, 2435 1128
Fax: 2435 7333, 2435 7980
email: info@goodwordbooks.com
website: www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES

Single copy Rs. 10
One year Rs. 110. Two years Rs. 200
Three years Rs. 300. Five years Rs. 480
Abroad: One year $10/£6 (Air Mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
434, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info @ ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
Al-RISALA FORUM INTERNATIONAL
5801 SW 106th Ave,
Cooper City, FL 33328 U.S.A.
Tel. (954) 4358404, Fax: (954) 4342551
e-mail: kaleem@alrisala.org

Printed and published
by Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.
Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

آ گئے۔ اس کے بعد ۵ دسمبر تک انھی کے گھر پر قیام رہا۔ مختلف جگہوں سے لوگوں کے تقاضے تھے مگر میں رمضان کی وجہ سے اِدھر اُدھر نہ جاسکا۔ بعد کے تمام دن صغیر اسلم صاحب کے ساتھ گزرے۔ چنانچہ اس زمانۂ قیام کے تجربات زیادہ تر صغیر اسلم صاحب یا ان کے آس پاس کے ماحول سے متعلق ہیں۔

امریکا میں کئی افراد اور گروپ ہیں جو ہندستان اور پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں کی تعلیم کے لیے کافی کام کررہے ہیں۔ چنانچہ ان کی مدد سے ان ملکوں میں ہزاروں مسلم نوجوانوں کو پروفیشنل تعلیم حاصل کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ کئی ادارے مسلمانوں کو تعلیم یافتہ بنانے کے لیے سرگرم ہیں۔ یہاں ان امریکی مسلمانوں سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ مسلمانوں کی اقتصادی ترقی کے لیے جو کام کررہے ہیں وہ بجائے خود بہت اہم ہے مگر بہر حال وہ ایک ثانوی کام ہے۔ اصل کام جس کی آج سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ مسلمانوں کو اسلامی قیادت دینا ہے۔ میں نے کہا کہ چند سو سال پہلے ہمارے مدارس یہ کام کررہے تھے۔ مدارس کے ذریعہ نہ صرف دینی تعلیم زندہ تھی بلکہ یہی مدارس وہ افراد بھی پیدا کررہے تھے جو مسلمانوں کو اسلامی قیادت فراہم کرسکیں۔ مگر اب یہ کام عملاً ختم ہوگیا ہے۔ یہ مدارس اس اعتبار سے اپنی عمر ختم کرچکے ہیں۔ ان کا موجودہ نظام دورِ جدید کی قیادت فراہم کرنے کے لیے اسی طرح ناکافی ہے جس طرح ہندی کا کورس انگریزی انشا پرداز پیدا کرنے کے لیے۔

ہمارے موجودہ مدرسے قدیم شرحیں پڑھاتے ہیں جب کہ آج جدید شرحوں کی ضرورت ہے۔ ان مدرسوں کے نصاب میں جو کتابیں ہیں ان میں مناظرہ کا موضوع ہے مگر ڈائیلاگ کا موضوع نہیں۔ ان میں جہاد کے ابواب ہیں مگر پُر امن دعوت کے ابواب نہیں، ان میں غیر تنقیدی ذہن کی تشکیل کی جاتی ہے جب کہ آج دنیا میں تنقیدی ذہن کا دور آچکا ہے۔ ان مدارس کی تعلیم اسی قدیم نہج پر ہوتی ہے۔ گویا کہ تاریخ کا سفر ان کے مفروضہ اکابر پر ختم ہوگیا ہے جب کہ ان کے باہر کی دنیا میں تاریخ کا سفر ان کے اپنے اکابر کے دور سے بہت زیادہ آگے جاچکا ہے، وغیرہ۔

۲۵ نومبر ۲۰۰۰ کی شام کو میں جناب صغیر اسلم صاحب کے مکان پر تھا۔ وہاں ان کے داماد

جناب عمران صاحب آ گئے۔ وہ ایک کمپیوٹر کمپنی میں ہیں جہاں ہندستان اور پاکستان کے کئی مسلمان کام کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جن مسلمانوں سے میری ملاقات ہوئی وہ اکثر آپ کے بارے میں منفی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ان لوگوں کی شکایتیں جھوٹی شکایتیں ہیں، ان کا سچائی سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر میں نے کہا کہ اللہ کے فضل سے میں نے جو سچائی دریافت کی ہے وہ اتنی زیادہ عظیم ہے کہ اس کے بعد کوئی بھی محرومی میرے لیے محرومی نہیں۔ یہ گفتگو رات کے ۹ بجے ہو رہی تھی۔ میں نے کہا کہ اس وقت میں صغیر اسلم صاحب کے گھر پر ہوں۔ اگر وہ اپنے گھر سے نکال دیں اور کہیں کہ تم میرے گھر میں کیسے گھس آئے ہو، فوراً باہر جاؤ تو میں کسی شکایت کے بغیر نہایت خاموشی اور سکون کے ساتھ باہر چلا جاؤں گا۔ اس لیے کہ صغیر اسلم صاحب مجھ سے اپنا گھر چھین سکتے ہیں، مگر وہ مجھ سے خدائے برتر کو نہیں چھین سکتے۔ وہ کائنات کو مجھ سے نہیں چھین سکتے۔ وہ میری معرفتِ حق کو مجھ سے نہیں چھین سکتے۔

صغیر اسلم صاحب کے گھر سے محرومی کے بعد بھی ایمان باللہ کا زیادہ بڑا سرمایہ مجھے حاصل رہے گا جس پر میں اعتماد کرسکوں۔ مجھ کو ایک زمین ملی ہوئی ہوگی جس کے اوپر میں چلوں پھروں۔ اس کے باوجود میرے گرد وپیش ہوا ہوگی جس سے میں سانس لے سکوں، درخت ہوں گے جس کی سرسبزی میں میں خدا کی ربوبیت کا جلوہ دیکھوں۔ حقیقت یہ ہے کہ صغیر اسلم صاحب کے گھر سے محرومی کے بعد بھی مجھے اس سے بہت زیادہ بڑی چیز حاصل رہے گی۔ پھر میرے لیے شکایت اور احساس محرومی کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو لوگ محرومی میں جیتے ہوں اُن کے پاس ہمیشہ شکایت کے الفاظ ہوتے ہیں۔ مگر میں اللہ کے فضل سے یافت میں جیتا ہوں۔ اس لیے میری زبان وقلم سے شکایت کے الفاظ بھی نہیں نکلتے۔

آرنج کاؤنٹی میں ایک ادارہ ہے جس کو میں نے ۲۹ نومبر ۲۰۰۰ کو دیکھا۔ یہ ادارہ ۱۹۹۰ میں قائم ہوا۔ اس کے فاؤنڈنگ ڈائرکٹر شبیر منصوری صاحب (پیدائش ۱۹۴۵) ہیں۔ اس ادارہ کا نام یہ ہے:

Council on Islamic Education

یہ ادارہ اُسی مقصد کے لیے قائم ہے جس کو ہندستانی مسلمانوں کی زبان میں اصلاح نصاب

کہا جاتا ہے۔ یعنی اسکول میں پڑھائی جانے والی کتابوں کی تاریخی غلطیوں کو درست کرنا۔ مگر ہندستانی مسلمانوں کی اصلاح نصاب کمیٹی کے مِقابلہ میں وہ زیادہ سائنٹفک ہے اور اسی کے ساتھ زیادہ مؤثر بھی۔

ان لوگوں نے یہ کیا کہ ایک طرف اسکول میں پڑھائی جانے والی کتابوں کا مطالعہ کرکے یہ معلوم کیا کہ ان کتابوں میں مسلم نقطۂ نظر سے کیا غلطیاں ہیں۔ مثال کے طور پر ایک نصابی کتاب جس کا نام صدیوں کے درمیان (Across the Centuries) ہے، اس میں ۵۰ صفحہ کا ایک باب اسلامی تاریخ پر ہے جس کا عنوان یہ تھا:

A Moment in Time: A Caravan Camel.

اس کے آغاز (صفحہ ۵۴) پر اونٹ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس ادارہ نے اس کو بدلوایا۔ کتاب کے نئے ایڈیشن میں اونٹ کی تصویر نکال دی گئی ہے اور اس کا نیا عنوان ان الفاظ میں قائم کیا گیا ہے:

Desert Bloom—Carvan Cities

اس ادارہ نے اسکولی نصاب کی کتابوں میں اس قسم کی بہت سی اصلاحات کرائی ہیں، مگر اس کا طریقہ جو انہوں نے اختیار کیا وہ ہندستان سے بہت زیادہ مختلف تھا۔ انہوں نے اس کام کو مسلم کاز کے طور پر نہیں اٹھایا بلکہ جدید ذہن کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا سائنٹفک طریقہ اختیار کیا۔

اس معاملہ میں مغربی ذہن کے دو دور ہیں۔ ایک وہ جو لمبی صلیبی جنگوں (Crusades) کے بعد شروع ہوا۔ اس دور میں مغربی علماء کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی تصویر کو بگاڑ کر پیش کریں۔ ٹامس کارلائل نے انیسویں صدی میں اس ذہن کو بدلنے کی کوشش کی۔ دوسری عالمی جنگ تک یہ ذہن تقریباً پوری طرح بدل گیا۔ اب مغربی علماء کا ذہن یہ ہے کہ دوسرے شعبوں کی طرح، اسلام اور مسلمانوں کی تصویر کو عین مطابق واقعہ (as it is) پیش کریں۔

اسی عمومی ذہن کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ امریکا میں نصابی کتابوں کی تیاری کا جو ادارہ ہے وہ کسی کتاب کی تیاری سے پہلے اس سے متعلق مختلف گروہوں کے علماء سے معلومات حاصل کرتا ہے تاکہ ان

کی کتاب میں ہر گروہ کی ٹھیک ٹھیک نمائندگی ہو سکے۔ مذکورہ ادارہ نے اس امکان کو استعمال کیا اور پروفیسروں کی ایک ٹیم تیار کی جو نصابی موضوعات پر قابل اعتماد علمی رائے دے سکے۔ اس کے بعد انہوں نے ان امریکی اداروں سے روابط قائم کیے جو تعلیمی کتابیں تیار کرتے ہیں اور چھاپتے ہیں۔ انہوں نے ان امریکی اداروں کو یقین دلایا کہ وہ انہیں نصابی موضوعات پر قابل اعتماد معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔ اس طرح دونوں کے درمیان سلسلہ شروع ہوا۔

سی آئی ای نے یہ کام مسلم دفاع کے طور پر نہیں شروع کیا بلکہ خالص علمی انداز میں شروع کیا۔ چنانچہ وہ جو معلومات فراہم کرتے ہیں وہ صرف اسلام کے بارے میں نہیں ہوتیں بلکہ ہر مذہب اور کلچر کے بارہ میں ہوتی ہیں۔ ان کے اس انداز کی بنا پر امریکی تعلیمی اداروں میں ان کو پسند کیا گیا۔ یہاں تک کہ کنسلٹنٹس اور ریویورس کی فہرست میں ان کا نام بھی شامل ہو گیا۔ ایسے مددگاروں کی تعداد تقریباً تیس ہے۔

۲۹ نومبر کو جب کہ میں سی آئی ای کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا اسی دوران ورجینیا سے انٹرنیشنل نیوز روم (News Room) کا ٹیلی فون آیا۔ وہ کونسل کے ڈائرکٹر شبیر منصوری صاحب سے ٹیلی فون پر انٹرویو لے رہے تھے۔ انہوں نے ان سے چند سوالات کیے۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ ہم پبلک اسکولوں میں مذہب کی تعلیم کیوں دیں۔ تقریباً ۱۵ منٹ کے بعد جب انٹرویو ختم ہوا تو نیوز روم کی نمائندہ اسٹیسی میٹنگلی (Stacy Mattingly) نے کہا کہ آپ سے اور دوسرے مسلمانوں سے ہم نے یہ سمجھا ہے کہ مسلمانوں میں جو کھلا پن (opennes) ہے وہ ان کے اپنے مذہب کی تعلیمات کی بنا پر ہے:

> Stacy indicated that the approach of CIE to contribute rather than confront is very much based on universal aspect of Islam. She also stated many Muslim organizations that she spoke to also had similar broad thinking.

سی آئی ای کے اس کام پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے کہا کہ میرے نزدیک یہ براہ راست معنوں میں دعوت کا کام تو نہیں ہے، البتہ وہ اس دعوہ پراسس کا ایک جزء ہے جو اس وقت ساری دنیا

میں جاری ہے۔ موجودہ زمانہ کا ایک نیا ظاہرہ یہ ہے کہ اسلام میں مختلف اعتبار سے ایسے عمومی پہلو پیدا کردیے گیے ہیں جنہوں نے اس کو عالمی مطالعہ کا موضوع بنادیا ہے۔ چنانچہ ریڈیو اور ٹی وی پر اسلامی پروگرام آتے ہیں۔ اسی طرح سے میک ملن اور پنگوئن جیسے ادارے اسلام پر کتابیں چھاپ رہے ہیں۔ اس طرح مختلف ذرائع سے اسلام کا تعارف ہورہا ہے۔ اس کو میں دعوہ پراسس کہتا ہوں۔ سی آئی ای کے موجودہ کام کو بھی اس عالمی دعوہ پراسس کا ایک جزء کہا جاسکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ دعوت اگر براہ راست اسلامی تبلیغ کا نام ہے تو سی آئی ای جیسے اداروں کا کام گویا بالواسطہ تبلیغ۔

امریکا کے سفر میں ۲۴ نومبر ۲۰۰۰ کو اریزونا کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ میری تحریریں پڑھتے رہے ہیں اور انہوں نے اس سے بہت فائدہ حاصل کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں اسلام کے بارے میں کنزرویٹیو تھا۔ آپ کی کتابیں پڑھ کر مجھے شرح صدر ہوگیا۔ ان کا نام یہ ہے:

Muhammad A Subhan M.D.

امریکا کے سفر میں اس قسم کے بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ اکثر لوگوں نے یہی کہا کہ دوسری کتابیں پڑھ کر یا دوسروں کی تقریریں سن کر ہمارا ایک خاص ذہن بن گیا تھا۔ اور ہم اسی کو اختیار کیے ہوئے تھے۔ مگر آپ کی تحریریں پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ ہمارا یہ ذہن اسلام کے مطابق نہ تھا۔ چنانچہ اب اللہ کے فضل سے ہم صحیح اسلامی نظریہ کے مطابق سوچنے لگے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں میں جو محرّرین اور مقررین اُبھرے وہ سب ردعمل کی پیداوار تھے۔ حالات کے ردّعمل کے تحت ان کی جو سوچ بنی اس کو انہوں نے اسلام کی اصطلاحوں میں بیان کرنا شروع کردیا۔ موجودہ زمانہ میں اس قسم کی منفی تقریروں اور تحریروں کا ایک جنگل ہے جس میں مسلمانوں کی جدید نسل اپنے آپ کو گھرا ہوا پاتی ہے۔ یہ ایک قسم کی ذہنی کہر آلودگی (befogging of mind) کا مسئلہ ہے۔ الرسالہ مشن اللہ کے فضل سے اس ذہنی کہر کو دور کررہا ہے۔ وہ لوگوں کو اس قابل بنارہا ہے کہ وہ کھلے ذہن کے تحت اسلام کی سچی تصویر کو دیکھ سکیں۔

ایک واقعاتی مثال

۲۷ اگست ۱۹۵۷ کو ایک مسلم نوجوان پاکستان سے امریکا آیا۔ اس وقت اس کی عمر اکیس سال تھی۔ اس نے پاکستان میں B. A. کا کورس کیا تھا اور اب وہ امریکا میں مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مگر امریکا (Sacramento) پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس کی B.A. کی سند یہاں قابل قبول نہیں۔ چنانچہ اس کو دوبارہ پہلے سیکرامنٹو (Sacramento) کے اسٹیٹ کالج میں ۲ سال رہ کر B.A. کی ڈگری حاصل کرنی پڑی۔ اس کے بعد مسئلہ روزگار کا تھا۔ مگر مختلف کمپنیوں میں کوشش کرنے کے باوجود اسے روزگار نہیں ملا۔ مشکل سے ۱۹۶۱ میں ایک کمپنی براڈوے ہیل (Briadway Hale) میں ایک معمولی ملازمت ملی جس کو امریکا کی اصطلاح میں اسٹاک بوائے (Stock Boy) کہا جاتا ہے۔

اس واقعہ کے تقریباً دس سال بعد ۱۹۷۰ میں تاریخ دوسرا منظر دیکھتی ہے۔ امریکا کی ایک بڑی کمپنی (Wanahmakers in Philadelphia) اور (Marshal Field in Chicago) کو اپنی کمپنی میں خرید وفروخت کے لیے ایک بائر (buyer) کی ضرورت تھی، ایک ایسا بائر جو ممتاز طور پر لائق اور دیانت دار ہو۔ یہ کمپنی کی بے حد اہم پوسٹ تھی جس کے ہاتھ میں ۲۰ ملین ڈالر سالانہ سے زیادہ کا کاروبار ہوتا تھا۔ امریکی طریقہ کے مطابق، ایک ایکزیکیٹیو ریکروٹر (Executive Recruiter) کمپنی کو یہ ٹھیکہ دیا گیا کہ وہ اس کے لیے ایک مطلوب بائر تلاش کر کے بتائے۔

اس کمپنی نے اپنے ذرائع کے مطابق، پورے امریکا کا سروے کیا جس میں چند مہینے لگے۔ اس کے بعد اس نے مذکورہ کمپنی کو بذریعہ خط مطلع کیا کہ پورے امریکا میں سب سے زیادہ موزوں نوجوان جو اس کام کے لیے ملا ہے وہ صرف ایک ہے اور یہ نوجوان وہی تھا جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔

یہ جناب صغیر احمد اسلم (پیدائش ۱۹۳۶) تھے جو اب لاس اینجلیز (Los Angeles) میں رہتے ہیں۔ ان کو مذکورہ کمپنی کی طرف سے بائر کے اس عہدہ کی پیش کش کی گئی جس کو وہ منظور نہ کر سکے۔ کیوں کہ اب وہ خود اپنے کاروبار میں اتنا مشغول ہو چکے تھے کہ انہیں اور کسی کمپنی میں ملازمت کی ضرورت نہ تھی۔ وہ امریکا میں آباد مسلمانوں کے درمیان ان محدود افراد میں شمار کئے

جاتے ہیں جنہوں نے زیرو کے مقام سے آغاز کر کے یہاں ایسی ترقی حاصل کی جو بہت سے لوگوں کے لیے قابل رشک ہے۔ ترقی کا یہ سفر انہوں نے کیسے طے کیا اس کا خلاصہ دو لفظ میں یہ ہے — محنت اور دیانت داری۔

ان کی یہ داستان بہت لمبی ہے۔ انہوں نے اپنے عمل سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہر آدمی بڑی سے بڑی ترقی کر سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ اس ترقی کی مطلوب قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہو۔

مثلاً ۱۹۶۱ میں انہوں نے مختلف دفتروں اور کمپنیوں میں کام حاصل کرنے کی کوشش کی مگر کوئی انہیں کام دینے کے لیے تیار نہ ہوا۔ اس کا سبب غالباً وہی چیز تھی جس کو عام طور پر تعصب کہا جاتا ہے۔ کمپنی والوں کو پاکستان وغیرہ کے لوگ بیرون امریکی (Foreigner) دکھائی دیتے تھے جب کہ ان کا خیال تھا کہ کوئی امریکی آدمی ان کے لیے زیادہ مفید ہو سکتا ہے، نہ کہ غیر امریکی آدمی۔

صغیر اسلم صاحب نے اپنی محنت اور دیانت داری کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا کہ وہ کمپنی کے لیے ایک نہایت مفید کارکن ہیں۔ چنانچہ ان کے کام پر ایک ہفتہ گزرا تھا کہ کمپنی والوں نے اُن کی باقاعدہ تنخواہ مقرر کر دی۔ صغیر اسلم صاحب اس کمپنی میں ۱۱ سال (۱۹۶۱۔ ۱۹۷۲) رہے۔ کمپنی والوں نے ان کے ساتھ نہایت عزت کا سلوک کیا۔ ہر سال ان کی تنخواہ بڑھاتے رہے یہاں تک کہ جب انہوں نے خود اپنی مرضی سے ان کے کام کو چھوڑا تو انہیں کمپنی سے ملنے والی ماہانہ رقم پہلے سال کے مقابلہ میں پچیس گنا زیادہ ہو چکی تھی۔

صغیر اسلم صاحب نے اس کمپنی میں اپنے عمل سے کتنا زیادہ اعتماد پیدا کر لیا تھا اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہوتا ہے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ کمپنی کے مالک (Boss) سے ان کا سخت اختلاف ہو گیا۔ یہ باس جیب اسٹورٹ مارگڈر (Jeb Stuart Magrmder) ان سے ایک ایسا کام کرانا چاہتا تھا جو صغیر اسلم صاحب کے نزدیک اصول کے خلاف تھا۔ چنانچہ انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ جب بحث بڑھی تو وہ یہ کہہ کر اس کے پاس سے اٹھ گئے کہ میں آج ہی اپنا استعفیٰ (Resign) کمپنی کو دے دوں گا۔ جس کام کو میں اصول کے خلاف سمجھتا ہوں، اس کو کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ یہ کہہ کر وہ آفس سے اٹھ

گئے۔ ابھی وہ آفس کے بیرو دروازے پر پہنچے تھے کہ باس اپنی کرسی سے اُٹھ کر آیا اور اصرار کر کے ان کو واپس لے گیا اور ان سے کہا کہ آپ ہماری کمپنی کو ہر گز نہ چھوڑیں:

Company needs you. We can not afford to lose you.

آپ آزادی کے ساتھ اپنا کام کریں۔ آج کے بعد میں کبھی آپ کے کسی کام میں مداخلت نہ کروں گا۔

صغیر اسلم صاحب کا مزاج اور طریق کار عام لوگوں سے بہت مختلف ہے۔ چنانچہ کئی لوگ ان کو ایک منفرد انسان (man with a difference) کہتے ہیں۔ خود وہ اپنے بارے میں مذاق کے انداز میں کہتے ہیں کہ خدا نے مجھ کو پیدا کیا اور پھر اس سانچے کو پھینک دیا:

God Almigty made me and threw the mould away.

میں نے صغیر اسلم صاحب کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میرا احساس یہ ہے کہ وہ اس ہندی مقولہ کے مصداق ہیں کہ سادھاڑن گنوں سے اَسادھاڑن منُش بنتے ہیں۔

مجھے ذاتی طور پر اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ کسی آدمی کے اندر طلسماتی صفات ہوں یا وہ کراماتی شعبدے دکھاتا ہو۔ اسی طرح مجھے اس سے بھی کوئی دلچسپی نہیں کہ کوئی آدمی شاندار گفتگو کرنا جانتا ہو۔ وہ ہائی پروفائیل (High Profile) میں کلام کرے اور بڑے بڑے اقدامات کا کارنامہ دکھائے۔ مجھے اس سے بھی دلچسپی نہیں کہ کوئی شخص حکمرانوں کو للکارے اور چیلنج (challenge) کی زبان بولے۔ یہ چیز بھی مجھے متاثر نہیں کرتی کہ کوئی شخص ایسے کام کرنے کا ماہر ہو جو میڈیا میں نمایاں ہو اور عوام کی بھیڑ اس کے گرد اکھٹا ہو جائے۔ اس قسم کی تمام چیزوں کو میں سطحیت سمجھتا ہوں، اور سطحیت سے مجھے اس قدر بیزاری ہے کہ ایسی چیزوں کا تذکرہ کرنا ہی مجھے پسند نہیں۔

صغیر اسلم صاحب کی شخصیت جس بنا پر مجھے قابل تذکرہ نظر آئی وہ یہ کہ ان کی زندگی میں ہر انسان کے لیے سبق ہے۔ ان کی زندگی فطرت کے سادہ اصولوں پر عمل کر کے بنی ہے۔ ان کی زندگی کے اصول اتنے زیادہ سادہ ہیں کہ کوئی بھی شخص ان پر عمل کر سکتا ہے۔ جس طرح خود انہوں نے ان پر عمل کیا اور پھر ترقی حاصل کی۔

مثال کے طور پر ان کی زندگی کا ایک سادہ فارمولا وہ ہے جس کو میں پازیٹیو ایڈجسٹمنٹ (positive adjustment) کہتا ہوں۔ ان کا حال یہ ہے کہ وہ کسی سے کوئی معاملہ کر رہے ہوں گے اور پھر درمیان میں وہ آدمی ایک مختلف بات کہہ دے گا۔ ایسی حالت میں صغیر اسلم صاحب اس آدمی سے الجھنے کے بجائے یہ کہیں گے کہ چلو، یہ بھی ٹھیک ہے اور پھر ایک لمحے میں بات ختم ہو جائے گی۔ مثلاً اگر میں کسی دن صبح کے وقت ان کے گھر پہنچوں اور وہ میرے لیے اگلے ویک انڈ (weekend) کا پروگرام بنانے لگیں، پھر میں کہوں کہ مجھے آج ہی شام کو واپس جانا ہے تو وہ فوراً کہیں گے، چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔ اس کے برعکس اگر میں ان کے گھر جاؤں اور ان سے کہوں کہ مجھے آپ کے ہاں ایک ہفتہ رہنا ہے، تب بھی وہ صرف یہ کہہ دیں گے، چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔

''چلو یہ بھی ٹھیک ہے'' کا یہ فارمولا ان کے لیے بے حد مفید ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ وہ اس ذہنی ٹینشن سے پوری طرح بچے رہتے ہیں جس میں بیشتر لوگ مبتلا نظر آتے ہیں۔ اپنے اس فارمولے کی بنا پر غصہ اور جھنجھلاہٹ، مایوسی اور بُزدلی جیسی منفی چیزیں ان کے دل میں جگہ نہیں پاتیں۔ ان کو وہ نعمت پوری طرح حاصل ہے جس کو ذہنی سکون (mental peace) کہا جاتا ہے۔ مثلاً شعبان کی آخری تاریخ کی شام کو میں ان کے یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ ہم لوگ کسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ درمیان میں انہوں نے کہا کہ اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں تھوڑی نیند لے لوں۔ اس کے بعد وہ گئے اور تھوڑی دیر سو کر ٹھیک مقرر وقت پر واپس آ گئے۔ اپنے ذہن کو غیر ضروری باتوں سے خالی رکھنے کا یہ فائدہ ہے کہ وہ رات کو سکون کی نیند سوتے ہیں۔

ان کا ہاضمہ ٹھیک کام کرتا ہے۔ وہ اعصابی تناؤ سے بالکل محفوظ ہیں۔ ۶۵ سال کی عمر ہونے کے باوجود وہ جوانوں کی طرح کام کرتے ہیں۔ اور یہ سب اس سادہ فارمولے کا نتیجہ ہے کہ — چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔

اسی طرح ان کا ایک خیال یہ ہے کہ مخالفانہ باتوں کو برداشت کرنے سے آدمی کے گناہ کم ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تم میرے خلاف جتنی زیادہ باتیں کرو گے اتنے زیادہ میرے گناہ معاف

ہوں گے۔ چنانچہ وہ اپنے مخالفین کے بارہ میں اطمینان سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ تم میرے خلاف باتیں کرکے میرے گناہوں پر جھاڑو لگاتے رہو۔ اس فارمولے کا فائدہ ان کو یہ ملا ہے کہ اُن کو کسی شخص کے خلاف نفرت نہیں ہوتی، خواہ وہ شخص ان کے خلاف کتنی ہی زیادہ نفرت کی باتیں کرنے میں لگا ہوا ہو۔

صغیر اسلم صاحب کے ساتھ وہی مسئلہ ہے جو ہر اس آدمی کے ساتھ ہوتا ہے جو زیادہ ترقی کر جائے۔ چنانچہ بہت سے لوگ جو ترقی کی دوڑ میں صغیر اسلم صاحب سے پیچھے رہ گئے وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اُن کے خلاف حسد میں مبتلا رہتے ہیں۔ اس کا اظہار بار بار مختلف شکلوں میں ہوتا رہتا ہے۔

یہ حاسدین اپنے مخالفانہ پروپیگنڈے میں مصروف تھے۔ مگر صغیر اسلم صاحب نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک دن ان کے پاس ایک شخص آیا اور اُن سے کہا کہ فلاں آدمی آپ کے خلاف ایسی ایسی باتیں کہہ رہا ہے، اور آپ اس کے جواب میں کچھ نہیں کرتے۔ صغیر اسلم صاحب نے کسی شکایت کے بغیر معتدل انداز میں جواب دیتے ہوئے کہا "یہ ان کا پرابلم ہے، میرا پرابلم تو نہیں۔"

اسی قسم کے سادہ اور فطری اصول ہیں جن کے ذریعہ صغیر اسلم صاحب نے اپنی کامیاب زندگی کی تعمیر کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کامیاب زندگی کا اصلی اور حقیقی فارمولا یہی ہے۔ جو بڑی بڑی باتیں کرتا ہے اور شاندار اسٹیج پر دکھائی دیتا ہے وہ صرف ایک لیڈری ہے۔ اس قسم کی لیڈری سے کچھ افراد کو شہرت اور عظمت تو ضرور مل جاتی ہے، مگر یہ کچھ افراد کی ذاتی کامیابی ہے جو انہیں اس قیمت پر ملتی ہے کہ قوم تباہی اور بربادی کا شکار ہو کر رہ جائے۔

میرے نزدیک صغیر اسلم صاحب جیسے غیر لیڈر افراد ہی اس قابل ہیں کہ انہیں حقیقی لیڈری کا کریڈٹ دیا جائے۔ صغیر اسلم صاحب نے اپنی زندگی کی تعمیر کر کے دوسروں کو تعمیر کا راستہ دکھایا۔ اس کے برعکس جو لوگ شہرت اور عظمت کے آسمان پر نظر آتے ہیں، وہ صرف تخریب کا انعام پانے کے مستحق ہیں، کیوں کہ باعتبار نتیجہ انہوں نے اس کے سوا کوئی اور کارنامہ انجام ہی نہیں دیا۔

اور بلاشبہہ زندگی کی کامیابی کا ایک راز یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو خارجی حالات کا شکار نہ

ہونے دے، وہ خود اپنے اصولوں کی بنیاد پر اپنی زندگی کی تعمیر کرے۔ صغیر اسلم صاحب کے اندر یہ امتیازی صفت ہے کہ وہ وقتی حالات کا اثر قبول نہیں کرتے۔ وہ خود اپنے سوچے سمجھے اصولوں کی بنیاد پر اپنی زندگی کا نقشہ بناتے ہیں۔

امریکا میں رہنے والے مسلمان عام طور پر یہاں کے کلچر کے مطابق، کوٹ پتلون کا لباس اختیار کر لیتے ہیں۔ مگر صغیر اسلم صاحب یہاں بھی زیادہ تر کرتہ اور شلوار پہنتے ہیں۔ یہاں اکثر ہندستان اور پاکستان کے لوگوں کی طرف سے انٹرٹینمنٹ کے پروگرام ہوتے ہیں جن میں قوالی، مشاعرہ، رقص وسرود جیسے تفریحی آئٹم ہوتے ہیں۔ لوگ مہنگے ٹکٹ لے کر بڑی تعداد میں ان پروگراموں میں شریک ہوتے ہیں۔ مگر صغیر اسلم صاحب ایسے پروگرام میں شرکت نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اپنی طرف سے ٹکٹ لا کر اُنہیں دے دے تب بھی وہ وہاں نہیں جاتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ طریقہ اپنی بااصول شخصیت کو محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ مگر یہاں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس بے اصولی سے بچے ہوئے ہوں۔

اسی طرح شادیوں کی دھوم جو ہندستان اور پاکستان میں ہوتی ہے وہ مزید اضافہ کے ساتھ امریکا میں بھی موجود ہے۔ مگر صغیر اسلم صاحب اس معاملہ میں بھی اپنی انفرادیت کو باقی رکھے ہوئے ہیں۔ یہاں کے عام مسلمان اپنی شادیوں کی تقریبات بڑے بڑے ہوٹلوں یا کمیونٹی سینٹر میں نہایت مسرفانہ انداز میں کرتے ہیں۔ مگر صغیر اسلم صاحب نے اپنی بڑی لڑکی کی شادی خود اپنے گھر پر کی اور سادہ انداز میں اُس کو انجام دیا۔

شادیوں کی دھوم کے معاملہ میں ہندستان اور پاکستان کے مسلمان اگر بدعت میں مبتلا ہیں تو امریکا کے مسلمان بھی اس معاملہ میں سُپر بدعت کی حد تک پہنچ چکے ہیں۔ یہاں اس معاملہ میں تین رسمیں یکساں شان وشوکت کے ساتھ منائی جاتی ہیں۔ سب سے پہلے منگنی، جس میں پوری دھوم کے ساتھ ہونے والے شوہر اور بیوی ایک دوسرے کو انگوٹھی پہناتے ہیں۔ اس کے کچھ عرصہ بعد نکاح کی تقریب ہوتی ہے جس میں دوبارہ تمام رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔ اس کے کچھ عرصہ بعد رخصتی کی رسم ادا کی

جاتی ہے جس کی مسرفانہ دھوم کو دیکھنا کسی صاحب ذوق آدمی کے لیے ایک سزا سے کم نہیں۔

عجیب بات ہے کہ اسی امریکا میں یہاں کے عیسائیوں کی اکثریت نہایت سادگی کے ساتھ اپنی شادی کی تقریب ادا کرتی ہے۔ مگر اسی ملک میں مسلمانوں کا معاملہ بالکل برعکس ہے۔ برصغیر ہند کے مسلمان ہندستان کے ہندوؤں سے نفرت کرتے ہیں۔ مگر یہی مسلمان ہندستان اور پاکستان میں اور اسی طرح باہر کے ملکوں میں شادی کے معاملہ میں ہندوؤں کی رسموں کو مزید اضافہ کے ساتھ پکڑے ہوئے ہیں۔

۲ نومبر ۲۰۰۰ کو میں امریکا میں تھا۔ مجھ کو بتایا گیا کہ آج فلاں مسلمان کے لڑکے کی منگنی کی رسم ایک کمیونٹی سینٹر میں ہو رہی ہے۔ لوگوں کے کہنے کی بنا پر میں بھی وہاں چلا گیا۔ میرا مقصد اس کو دیکھنا تھا نہ کہ شرکت کرنا۔ وہاں یہ معلوم کرکے روحانی تکلیف ہوئی کہ عام قسم کی مسرفانہ دھوم کے علاوہ وہاں رقص و سرود بھی ہو رہا تھا۔ حتیٰ کہ ہونے والے شوہر اور بیوی نے ایک دوسرے کے ہاتھ میں انگوٹھی پہنائی۔ مزید یہ کہ یہ رمضان کے مہینہ کی پہلی رات تھی۔ میں نے کہا کہ رمضان کے استقبال کا کیسا انوکھا طریقہ ہے جس کو یہاں کے مسلمانوں نے اختیار کیا ہے۔

صغیر اسلم صاحب اس طرح کی فضول رسموں سے بڑی حد تک بچے ہوئے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ وہ اپنی بااصول شخصیت کو محفوظ رکھنے میں کامیاب ہیں۔

۱۹۸۷ کی بات ہے، صغیر اسلم صاحب کی بڑی صاحبزادی صائمہ پروین اسلم امریکن نرسری اسکول سے پڑھ کر آئی۔ گھر واپس آکر بچی کی زبان سے ایک لفظ نکلا۔ یہ ایک گندا لفظ تھا جس کو اس نے اسکول میں سنا تھا۔ صغیر اسلم صاحب نے جونہی بچی کی زبان سے یہ لفظ سنا تو فوراً ان کو احساس ہوا کہ ہماری قوم کے چھوٹے بچے جو سیکولر اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں وہ وہاں نہایت غلط تربیت پا رہے ہیں۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ ہم کو ایک ابتدائی اسکول کھولنا ہے جہاں ہمارے بچے بھی پڑھیں اور دوسرے مسلمانوں کے بھی۔

اسلامک سوسائٹی آف آرنج کاؤنٹی اُس وقت صرف ایک مسجد پر مشتمل تھی۔ پہلے یہاں ایک

مسیحی چرچ تھا۔ اس کو خرید کر مسجد کی صورت دے دی گئی۔ صغیر اسلم صاحب سوسائٹی کے ذمہ داروں سے ملے اور کہا کہ ہمیں یہاں اپنے بچوں کے لیے ایک اسکول کھولنا ہے۔ اس وقت لوگوں نے اس کو ایک خیالی بات سمجھا۔ کیوں کہ ظاہری حالات کے اعتبار سے سوسائٹی اس پوزیشن میں نہ تھی کہ وہ ایک اسکول کھول سکے۔

صغیر اسلم صاحب نے کہا کہ یہ مسئلہ وسائل کا نہیں ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے لیے یہاں دوسرا کوئی انتخاب ہی نہیں:

We do not have any other choice, we must have a school.

صغیر اسلم صاحب کئی ہفتے تک سوسائٹی کے ذمہ داروں کے پاس جاتے رہے اور وہ لوگ ہر میٹنگ میں اسکول کے مسئلہ کو ٹالتے رہے یہاں تک کہ ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ گذر گیا۔ آخرکار جب انہوں نے دیکھا کہ صغیر اسلم صاحب اپنا اصرار جاری رکھے ہوئے ہیں:

He will not give up. He is persistent

انہوں نے کہا کہ اچھا اگلے ماہ ہم اسکول کھول دیں گے۔ اس کے بعد صغیر اسلم صاحب نے کہا کہ آپ میں سے کتنے لوگ گارنٹی دیتے ہیں کہ آپ اگلے ماہ تک زندہ رہیں گے۔ یہ سن کر تمام لوگ چپ ہو گئے۔ اور پھر کہا کہ ہم اسکول کھولنے کے لیے تیار ہیں مگر ہمارے پاس نہ زمین ہے اور نہ بلڈنگ اور نہ ہی استاذ۔ صغیر اسلم صاحب نے کہا کہ ہمارے پاس جو محدود جگہ ہے اسی پر ہم اپنا اسکول شروع کر دیں گے۔ اور جہاں تک ٹیچر کا سوال ہے تو میں اور میری بیوی رضا کارانہ طور پر ٹیچر بننے کے لیے تیار ہیں۔

اس کے بعد ۱۹۸۸ میں مسجد کے ساتھ ہی ایک کمرے میں اسکول کا آغاز کر دیا گیا۔ صغیر اسلم صاحب نے نہ صرف خود بلکہ اپنے احباب کے ذریعہ مسلسل اس اسکول کے لیے ہر قسم کا تعاون فراہم کیا۔ یہاں تک کہ آج وہ ایک معیاری اسکول کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اس کی اپنی مستقل بڑی عمارت ہے۔ آٹھویں کلاس تک کی تعلیم ہوتی ہے۔ اس میں ۶۰۰ سے زیادہ اسٹوڈنٹ ہیں اور ۲۱ ٹیچر

کام کر رہے ہیں۔ اب صغیر اسلم صاحب کا اگلا خواب یہ ہے کہ وہ اس ادارہ کو ایک معیاری اسلامک یونیورسٹی بنادیں۔ اور حالات جس طرح ترقی کر رہے ہیں، بظاہر ایسا ہونا کوئی بعید از قیاس بات نہیں۔

۲۹ نومبر ۲۰۰۰ کو مجھے یہ کہانی معلوم ہوئی تو مجھے ایک عرب شیخ کا قول یاد آیا جس نے کہا تھا: رجلٌ ذو همة يحيي الأمة (ایک باہمت آدمی پوری قوم کو زندہ کر دیتا ہے) حقیقت یہ ہے کہ کوئی بڑا کام ہمیشہ ایک ہی آدمی کرتا ہے۔ بڑا کام کرنے کی شرط یہ ہے کہ انسان کے دل میں اس کی آگ لگ جائے۔ اس قسم کی آتشیں تڑپ کسی ایک فرد ہی میں پیدا ہوتی ہے نہ کہ انسانوں کے کسی مجموعے میں۔ تڑپ اور لگن والے ایک انسان کا وجود میں آنا اس بات کی ضمانت ہے کہ افراد اور وسائل اس کے گرد جمع ہو جائیں اور وہ ان کو لے کر ہیروانہ انداز میں اپنے خواب کو واقعہ بنا سکے۔

۱۹۹۲ کا واقعہ ہے۔ اسلامک سوسائٹی آف آرنج کاؤنٹی میں عید کا اجتماع تھا۔ تقریباً تین ہزار مسلمان موجود تھے۔ صغیر اسلم صاحب نے سوسائٹی کے چیرمین کی حیثیت سے تقریر کی۔ اپنی تقریر کے درمیان انہوں نے کہا کہ امریکا ہم کو اپنے دین کے کام کے لیے ایسے مواقع دیتا ہے جو اس وقت کسی دوسرے ملک میں نہیں، حتیٰ کہ مسلم ملکوں میں بھی موجود نہیں۔ اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ مجھے فخر ہے کہ میں ایک امریکی مسلمان ہوں۔

I am proud to be an American Muslim.

اس تقریر کے بعد کچھ حاضرین صغیر اسلم صاحب سے سخت ناراض ہوئے۔ کچھ نے کہا کہ آپ امریکا کے پٹھو ہیں۔ آپ ایک نان مسلم ملک کی تعریف کر رہے ہیں۔ آپ اسلام دشمن طاقتوں کے ایجنٹ ہیں۔ یہاں تک کہ کچھ لوگوں نے صغیر اسلم صاحب کو پکڑ کر ان کا گلا گھونٹ دینا چاہا اور کہا کہ تم سوسائٹی کے چیرمین بننے کے قابل نہیں ہو۔

یہی موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا عام مزاج ہے۔ میں نے انڈیا میں ایسے بہت سے مسلمان دیکھے ہیں جو امریکا سے نفرت کی باتیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک امریکا ہر قسم کی برائیوں کا اڈہ ہونے کے علاوہ اسلامی ملکوں کا دشمن بھی تھا۔ اس کے باوجود ان کا حال یہ ہوا کہ پہلا موقع ملتے ہی

انہوں نے اپنے بیٹے یا بیٹی کو امریکا بھیج دیا۔ میں حیران ہوں کہ یہ کردار کی کون سی قسم ہے۔ لوگوں کو یا تو امریکا کی برائی نہیں کرنا چاہیے یا اگر وہ اس کو برا بتاتے ہیں تو اپنے بچوں کے مستقبل کی تعمیر امریکا میں نہیں کرنا چاہئے۔

صغیر اسلم صاحب کا مکان مسجد سے قریب ہے۔ ۲ رمضان کی شام کو ہم لوگ مسجد گئے۔ وہاں عشاء کی نماز اور تراویح کی نماز پڑھی گئی۔ یہاں کی تراویح ہندستان کی تراویح سے بہت مختلف تھی۔ لوگ اپنے آپ نظم کے ساتھ صفوں میں کھڑے ہو گئے۔ قاری نے ترتیل کے ساتھ قرآن کے ایک حصہ کی تلاوت کی۔ داخلی لاؤڈ اسپیکر کا انتظام بہت اچھا تھا۔ نماز کے بعد مجھ سے درس کے لیے کہا گیا۔ میں نے نماز کے بعد مختصر درس دیا۔

میں نے کہا کہ تراویح دراصل تہجد کی جماعتی صورت ہے جس کو لوگوں کی سہولت کی خاطر مقدم کرکے عشاء کے بعد رکھ دیا گیا ہے۔ تہجد کی نماز کو قرآن میں نافلہ کہا گیا ہے۔ یعنی مزید نماز۔ یہی تراویح کی حیثیت بھی ہے۔ تراویح کا اصل مقصد یہ ہے کہ عبادت کی حالت میں قرآن کو سننا، تا کہ وہ زیادہ موثر ہو سکے۔

میں نے دیکھا کہ آٹھ رکعت پوری ہونے کے بعد تقریباً نصف نمازی مسجد سے چلے گئے۔ میں نے کہا کہ تراویح میں اصل چیز رکعت نہیں بلکہ قرآن کو سننا ہے۔ میں ذاتی طور پر ۲۰ رکعت کے بجائے آٹھ رکعت کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔ مگر ایسا کرنا درست نہیں کہ ایک مسجد جہاں ۲۰ رکعت کی تراویح ہو رہی ہو آٹھ رکعت پڑھ کر آپ وہاں سے چلے جائیں۔ ایسا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے بقیہ حصہ کو آپ نے نہیں سنا۔ جو لوگ آٹھ رکعت کی صورت میں تراویح پڑھنا چاہتے ہوں انہیں اس کا علیحدہ انتظام کرنا چاہئے اور آٹھ رکعت کی شکل میں پورے قرآن کو سننا چاہئے۔ اس معاملہ میں جو انتخاب ہے وہ صرف آٹھ رکعت یا بیس رکعت میں نہیں ہے، بلکہ اس میں ہے کہ آپ یا تو آٹھ رکعت میں پورا قرآن سنیں یا بیس رکعت میں پورا قرآن سنیں۔ اس معاملہ میں کوئی تیسری صورت نہیں۔

صغیر اسلم صاحب نے بتایا کہ پچھلے تقریباً ۴۵ سال کے دوران مسلسل ان کی ڈیلنگ یہاں کے

سفید فام اور دوسرے لوگوں کے ساتھ رہی ہے۔ اس دوران انہیں سفید فام لوگوں کو بہت قریب سے جاننے کا موقع ملا۔ انہوں نے کہا کہ میں اپنے تجربہ کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ یہاں کے سفید فام لوگ بہت دیانتدار (honest people) ہیں۔ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ وہ اپنی ڈیوٹی پوری طرح انجام دیتے ہیں۔ وہ کسی کو دھوکہ نہیں دیتے۔ وہ اپنی غلطی کو فوراً مان لیتے ہیں۔ اگر کسی معاملہ میں ان کی رائے پوچھی جائے تو وہ ہمیشہ سنجیدگی کے ساتھ بات سنیں گے اور سنجیدگی کے ساتھ اُس کا جواب دیں گے۔

میں نے اب تک امریکا کے ۱۲ سفر کئے ہیں اور میں نے اپنے تجربہ کے دائرہ میں صرف چند ایسے مسلمان پائے ہیں جن کو امریکیوں سے نفرت نہ ہو بلکہ وہ ان کو پسند کرتے ہوں۔ ان میں سے ایک صغیر اسلم صاحب ہیں۔ وہ امریکا کو اپنا ملک سمجھتے ہیں اور امریکیوں کو اپنی قوم۔ اس لیے ان کے دل میں امریکیوں کے لیے عزت واحترام کے جذبات ہیں نہ کہ نفرت اور انتقام کے جذبات، جیسا کہ دوسرے اکثر لوگوں کا حال ہے۔

امریکا میں آج کل ایک ہزار سے زیادہ اسلامک سنٹر ہیں۔ ان میں سے کئی سنٹر میں نے خود دیکھے ہیں اور بہت سے سنٹروں کے بارے میں دوسروں سے معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ میں نے صغیر اسلم صاحب سے کہا کہ یہ تمام سنٹر اپنی حقیقت کے اعتبار سے اسلام کے سنٹر نہیں ہیں بلکہ وہ سوشلائیزیشن کے سنٹر ہیں۔ دوسرے ملکوں سے آنے والے مسلمان یہاں کی سوسائٹی میں شامل نہیں ہو پاتے۔ چنانچہ وہ سماجی علیٰحدگی کے احساس کا شکار رہتے ہیں۔ اس سماجی کمی کو پورا کرنے کے لیے وہ سنٹر بناتے ہیں۔ یہاں چھٹی کے دنوں میں مرد، عورت اور بچے بڑی تعداد میں اکٹھا ہوتے ہیں۔ صغیر اسلم صاحب نے میری اس رائے سے اتفاق کیا۔ انہوں نے کہا کہ میں خود بھی مسلمان مردوں اور عورتوں سے یہ بات کہا کرتا ہوں کہ آپ لوگ ان سنٹروں میں سوشلائیز کرنے کے لیے آتے ہیں نہ کہ واقعی معنوں میں اسلام کے لیے۔

پھر میں نے کہا کہ اس طبقہ میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بظاہر نہایت سنجیدہ دکھائی دیتے ہیں، مگر ان کا معاملہ بھی یہ ہے کہ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اسلام کو ایک کلچر کے روپ میں دیکھتے ہیں

اور مسلمانوں کی کلچرل پہچان (cultural identity) کو باقی رکھنے کے لیے وہ اس قسم کے ادارے بناتے ہیں۔

اس قسم کے تصور دین میں بیک وقت دو نقصانات ہیں۔ایک یہ کہ وہ اسلام کے نام پر ظاہری دھوم برپا کرنے کے باوجود حقیقی اسلام سے محروم رہتے ہیں۔انہیں کبھی اصلی اسلام کا تجربہ نہیں ہوتا۔

اس کا دوسرا نہایت سنگین نقصان یہ ہے کہ ایسے مسلمانوں کے اندر اپنی دعوتی ذمہ داری کا احساس بالکل ختم ہوجاتا ہے۔وہ نفسیاتی طور پر غیر مسلموں سے ملنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتے۔ان کی ساری سرگرمیاں صرف اپنے لوگوں کے اندر رہتی ہیں۔ان کے سارے پروگرام اپنے لوگوں کے ساتھ بنتے ہیں۔غیر مسلموں سے ان کی ملاقات زیادہ سے زیادہ سروس اور بزنس کی نسبت سے ہوتی ہے۔اس کے علاوہ ان کے سارے روابط اور تعلقات ہمیشہ اپنوں کے درمیان قائم ہوتے ہیں۔ غیر مسلم سرے سے ان کا کنسرن (concern) ہی نہیں ہوتے۔ایسی حالت میں غیر مسلموں میں اسلام کا پیغام پہنچانے کا جذبہ پیدا ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں۔

۲۸ نومبر ۲۰۰۰ کو صغیر اسلم صاحب کے مکان پر یہاں کے مختلف تعلیم یافتہ لوگوں سے ملاقات ہوئی۔مثلاً ڈاکٹر حبیب اللہ خاں، صفی قریشی صاحب، ظفر اقبال خاں صاحب، وغیرہ۔ان لوگوں سے تفصیلی باتیں ہوئیں۔بعد کو میں نے صغیر اسلم صاحب سے لوگوں کا تاثر پوچھا۔

انہوں نے کہا کہ میرے نزدیک سب سے زیادہ خاص بات یہ تھی کہ آج آپ کی گفتگو سے یہ معلوم ہوا کہ اسلام نام ہے — اللہ تعالیٰ کو ڈسکور (discover) کرنا، اس کے لیے سب سے زیادہ محبت ہونا، اللہ کو اپنا سب سے بڑا کنسرن (concern) بنانا۔

انہوں نے کہا کہ ہر ایک اصولی طور پر اس سے متفق تھا۔تاہم ہر ایک کے سامنے یہ سوال تھا کہ اس مقصد کو کس طرح حاصل کیا جائے۔میں سمجھتا ہوں کہ اس کا موقع بروقت ہی آدمی کو حاصل ہے۔ہر آدمی کے دل میں فطری طور پر یہ جذبہ ہے کہ وہ کسی کو اپنا سب سے زیادہ محبوب بنائے۔لوگ یہ کرتے ہیں کہ وہ اس فطری جذبہ کا مرکز اللہ کے سوا کسی اور کو بنا لیتے ہیں۔اب ان کو یہ کرنا ہے کہ وہ دوسری

چیزوں کو چھوڑ کر صرف اللہ کو اپنا مرکز توجہ بنائیں۔ ایک سوال یہ کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا ہی کیوں کیا۔ اس کی کیا ضرورت تھی کہ انسان جیسی ایک مخلوق دنیا میں آئے۔ وہ امتحانی حالات میں زندگی گزارے۔ اور پھر تھوڑے سے لوگ امتحان پاس کر کے جنت کے حق دار بن جائیں اور بہت سے لوگ ناکام ہو کر جہنم میں ڈال دیے جائیں۔

میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہوا کہ وہ ایک ایسی دنیا بنائے جو اللہ کی اپنی ذات کو چھوڑ کر ہر دوسری چیز سے بہتر ہو، یعنی جنت، اور پھر کچھ لوگوں کو یہ موقع دے کہ وہ جنت کی اس معیاری دنیا میں خوشیوں اور راحتوں کی ابدی زندگی گذار سکے۔ اس جنت میں بسانے کے لیے اس نے وہ بہترین نقشہ بنایا جس سے بہتر نقشہ اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ یعنی انسان کو پیدا کر کے اُسے مکمل آزادی دی جائے اور پھر جو افراد اس اعلیٰ صلاحیت کا ثبوت دیں کہ وہ آزادی کے باوجود اللہ کے پابند بن کر رہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے بے اعترافی کا اختیار رکھتے ہوئے اعتراف کا ثبوت دیا۔ کسی جبر کے بغیر انہوں نے خود اپنا فیصلہ لے کر صحیح اور مطلوب زندگی گذاری تو ایسے لوگوں کو جنت میں قیام کے لیے منتخب کیا جائے۔

یہاں کا انگریزی روزنامہ لاس اینجلیز ٹائمس کا شمارہ (۲۹ نومبر ۲۰۰۰) دیکھا۔ صفحہ اول پر اس میں ایک رپورٹ انسانی دماغ (Brain) پر تھی۔ اس ریسرچ میں برین اسکیننگ کی جدید ٹکنیک (FMRI) استعمال کی گئی تھی۔ اس کا مقصد یہ جاننا تھا کہ جب ان کو کچھ بتایا جائے یا پڑھ کر سنایا جائے تو ان کے دماغ میں کس قسم کی اعصابی حرکات ہوتی ہیں۔

Using a brain scanning technique called Functional Magnetic Resonance Imaging (FMRI) the work does highlight the differences in natural activity between men and women listening to something read aloud.

اس ریسرچ کے ذریعہ یہ معلوم ہوا ہے کہ مرد اپنے دماغ کے صرف ایک جانب سے سنتے ہیں جب کہ عورتیں اپنے دماغ کے دونوں سمت کو استعمال کرتی ہیں۔

Research released Tuesday shows that men listen with one side of their brains, while women use both sides.

اس ریسرچ میں ۱۰ تندرست مرد اور ۱۰ تندرست عورتوں پر تجربات کئے گئے۔ اس ریسرچ سے معلوم ہوا کہ مرد اور عورت کے دماغ یقینی طور پر یکساں نہیں ہیں:

They are definitely not the same—in size, sense or sensibilities.

۲۹ نومبر کی شام کو صغیر اسلم صاحب کے ساتھ ڈاکٹر مزمل صدیقی کے گھر گیا۔ انہوں نے افطار پر بلایا تھا۔ وہاں ان کے بیٹے اور داماد موجود تھے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ ان لوگوں سے دیر تک مفید گفتگو ہوتی رہی۔ ڈاکٹر صدیقی نے کہا کہ موجودہ حالات میں آپ کے نزدیک مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ مسلمان اگر صرف یہ کریں کہ وہ کچھ نہ کریں تو یقینی طور پر وہ کامیاب رہیں گے۔ اسلام کی اصل طاقت اس کی آئیڈیالوجی (ideology) ہے۔ یہ آئیڈیالوجی فطرت پر مبنی ہونے کی وجہ سے ہر انسان کو اپیل کرتی ہے۔ مگر موجودہ زمانہ مسلما ن ہر جگہ یا تو نفرت کی باتیں کرتے ہیں یا تشدد کو پھیلاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ غیر مسلم لوگ معتدل انداز میں اسلام پر غور نہیں کر پاتے۔

ایک صاحب نے کہا کہ نفرت کی فضا پیدا کرنے والا موجودہ میڈیا ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ میڈیا ہاٹ نیوز (Hot News) کو رپورٹ کرنے کی انڈسٹری ہے۔ اس کو سافٹ نیوز سے کوئی دلچسپی نہیں۔ چنانچہ اپنے اس مزاج کی بنا پر وہ لوگ مسلمانوں کی نفرت اور تشدد کی باتوں کو نمایاں کرتے ہیں۔ اس کا حل یہ نہیں ہے کہ آپ میڈیا کو برا کہیں۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ آپ ہر حال میں پُر امن انداز کا طریقہ اختیار کریں تاکہ میڈیا کو یہ موقع ہی نہ ملے کہ وہ آپ کی متشددانہ خبروں کو لے کر دنیا میں آپ کی تصویر کو بگاڑے۔

ایک اور سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ فلسطین اور کشمیر جیسے مقامات پر مسلمانوں کے لیے ایک ہی ممکن حل ہے اور وہ یہ ہے کہ وہاں صورت موجودہ (statusquo) کو قبول کرلیا جائے۔ ان مقامات کے مسلمانوں کے لیے جو انتخاب ہے وہ صورت موجودہ اور تباہی کے درمیان ہے نہ کہ صورتِ موجودہ یا کسی نئی صورت کے درمیان۔

اس مجلس میں امریکا کے مقبول مقررین، سراج وہاج اور حمزہ یوسف وغیرہ کا بھی تذکرہ ہوا۔

لوگوں نے ان کی تقریر کی تعریف کی۔ ایک نوجوان حمزہ یوسف کو بہت پسند کرتے تھے۔ ایک اور نوجوان سراج وہاج کی بہت تعریف کر رہے تھے۔

میں نے دونوں سے پوچھا کہ آپ لوگ اچھی طرح انگریزی جانتے ہیں اور ان کی بہت سی تقریریں سنی ہیں، آپ بتائیے کہ ان کی تقریر کا مغز (substance) کیا ہوتا ہے۔ یا یہ کہ ان کی تقریروں سے آپ کو کیا مسیج ملا ہے۔ دونوں نوجوانوں میں سے کوئی بھی اس کا جواب نہ دے سکا۔

پھر میں نے کہا کہ میں نے ان لوگوں کی تقریریں سُنی ہیں یا تو براہ راست یا ریڈیو پر۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں کی تقریریں ایک قسم کی ذہنی تفریح (intellectual entertainment) ہوتی ہیں۔ آپ اگر ان کو پسند کرتے ہیں تو پسند کیجئے مگر ان کو داعی نہ کہیے۔ کیوں کہ داعی وہ ہے جو سننے والوں کو کوئی واضح پیغام دے نہ کہ انہیں وقتی طور پر خوش کرے۔

ڈاکٹر صدیقی صاحب کے ہاں سے ہم واپس آئے تو صغیر اسلم صاحب کی صاحبزادی عائشہ پروین اسلم (عمر ۱۶ سال) نے کچھ سوالات کئے۔ میں نے کہا کہ سوال کرنا بہت اچھی عادت ہے۔

پھر میں نے کہا کہ لوگ عام طور پر صرف یہ جانتے ہیں کہ چیزوں میں صرف دو تقسیم ہے — یا تو وہ حلال ہوں گی یا حرام۔ مگر یہاں ایک اور تقسیم ہے جو اس سے زیادہ اہم ہے اور وہ ہے سطحیت اور غیر سطحیت۔

میں نے کہا کہ بہت سی چیزیں ہیں جو شرعی اعتبار سے حرام نہیں مگر ان سے صرف سستی تفریح حاصل ہوتی ہے۔ جو آدمی کسی بلند مقصد کے لیے جینا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ ایسی چیزوں کو چھوڑ دے۔ حرام چیز اگر اللہ کی نافرمانی ہے تو سستی تفریح یا سستی لذت کی تفریح اپنے وقت کا ضیاع۔

۱۹۷۲ کی بات ہے، صغیر اسلم صاحب ایک سفر کے دوران لاس اینجلیز ایرپورٹ پر تھے۔ ان کو سان فرانسسکو جانا تھا۔ کہر (fog) کی وجہ سے جہاز لیٹ ہو گیا۔ ائر پورٹ پر جہاں وہ بیٹھے تھے، پاس کی کرسی پر ایک اور مسافر بیٹھا ہوا تھا۔ تعارف کے دوران اس نے بتایا کہ وہ ڈیرل لیمونکا (Daryl Lamonica) ہے جو کہ کوارٹر بیک فار آکلینڈ رائڈرس

(Quarter Back For Oakland Raiders) ہے۔ وہ امریکن فٹ بال کی دنیا کا بہت بڑا اور مشہور کھلاڑی ہے۔ ائرپورٹ اور بعد میں ہوائی جہاز کے اندر لوگ اس کے پاس آتے رہے اور جھک کر اُس سے ملتے رہے۔ ان کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو اتنا خوش قسمت سمجھتے تھے کہ وہ ایک بڑے مشہور فٹ بال کھلاڑی سے مل رہے ہیں۔

مگر صغیر اسلم صاحب اُس سے ایک عام انسان کی حیثیت میں ملے۔ اس نے صغیر اسلم صاحب سے کہا کہ آپ میری زندگی میں پہلے انسان ہیں جو اس طرح مجھ سے مل رہے ہیں جیسے کہ ایک عام آدمی سے مل رہے ہوں۔ ورنہ میں جہاں بھی جاتا ہوں لوگ مجھے ہیرو کے انداز میں دیکھتے ہیں اور میرا والہانہ استقبال کرتے ہیں۔ صغیر اسلم صاحب اور ڈیریل لمونکا کا جہاز جب سان فرانسسکو پہنچا تو ڈیرل لیمونکا نے صغیر اسلم صاحب سے کہا کہ یہ میرا بزنس کارڈ ہے اور گھر کا فون نمبر اس پر لکھ دیا ہے۔ بڑے لوگ عام طور پر گھر کا نمبر کسی کو نہیں دیتے اور کہا کہ جب بھی آپ سان فرانسسکو آئیں تو میرے یہاں ضرور آئیں۔ میں آپ کو فٹ بال گیم دیکھنے کے لیے پہلی صف میں سیٹ لے کر دوں گا۔ صغیر اسلم صاحب نے کہا کہ مجھے فٹ بال کے گیم میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

وہ صغیر اسلم صاحب کی شخصیت سے اتنا زیادہ متاثر ہوا کہ اس نے اپنی کار پر بیٹھا کر ان کو ایرپورٹ سے ان کے ہوٹل تک پہنچایا اور پھر وہ اپنے گھر گیا۔ آخر میں رخصت ہوتے ہوئے اس نے دوبارہ کہا کہ اگر آپ کو فٹ بال سے انٹرسٹ نہیں ہے تب بھی آپ میرے گھر پر آئیں اور کم سے کم ایک وقت کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔

اس طرح کے واقعات صغیر اسلم صاحب کے ساتھ بار بار پیش آئے ہیں۔ یہاں سوال یہ ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ ایک بڑا آدمی ان لوگوں کو اہمیت نہیں دیتا جو اس کی بڑائی کا اعتراف کرکے اس کو زبردست عزت دیتے ہیں۔ اس کے برعکس صغیر اسلم صاحب جیسا آدمی جو سرے سے اس کی بڑائی کا اعتراف ہی نہیں کرتا اس کو وہ اتنا زیادہ قابل توجہ سمجھتا ہے اور اس کے ساتھ استثنائی طور پر خلوص کا معاملہ کرتا ہے۔

اس میں وہ اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کو چھوٹا سمجھ رہا تھا۔ مگر صغیر اسلم صاحب نے اس سے جو معاملہ کیا اس میں اس کو خود اپنا وجود چھوٹا ہوتا ہوا نظر آیا۔ اس کو شعوری یا غیر شعوری طور پر محسوس ہوا کہ دنیا میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جو میری عظمت کو رد کر رہا ہے گویا کہ وہ مجھ سے بھی زیادہ بڑا ہے۔

لوگ صرف یہ جانتے ہیں کہ بڑے آدمی کی بڑائی کا اعتراف کرو تو وہ تمہارا ہو جائے گا۔ مگر کسی بڑے آدمی کو جیتنے کا زیادہ کارگر طریقہ یہ ہے کہ آپ اس کے سامنے بالکل بےغرض بن جائیں اور اس سے ایسا معاملہ کریں جیسے کہ وہ آپ کی نظر میں صرف ایک معمولی انسان ہے نہ کہ کوئی بڑا انسان۔ بشرطیکہ آپ نے سرکشی کی بنا پر ایسا نہ کیا ہو۔

امریکا کے سفر میں مجھے ایک صاحب کے گھر جانا پڑا۔ کھانے کی میز پر انہوں نے کہا کہ میری بیوی بہت اچھا کھانا پکاتی ہے، وہ ہم کو روزانہ لذیذ کھانے کھلاتی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ کسی بیوی کی کوئی اچھی تعریف نہیں۔ بیوی کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ آپ کی زندگی کی ساتھی ہے نہ کہ صرف ایک عمدہ باورچی۔

پھر میں نے بتایا کہ انڈیا میں ایک بار میں ایک صاحب کے ہاں گیا۔ انہوں نے بھی آپ ہی کی طرح اپنی بیوی کی تعریف کی۔ انہوں نے بتایا کہ ایک بار میں ایک پارٹی میں گیا۔ واپس آیا تو میں نے اپنی بیوی سے پارٹی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہاں کھانے کا ہر آئٹم موجود تھا، مگر وہاں آئس کریم نہیں تھی۔ اس وقت رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ بیوی فوراً کھڑی ہوگئی۔ انہوں نے کہا کہ آپ صرف چند منٹ ٹھہریے میں آپ کو ابھی آئس کریم بنا کر کھلاتی ہوں۔ چند منٹ بعد میز پر تازہ آئس کریم کی پلیٹ رکھی ہوئی تھی۔

میں نے کہا کہ آپ لوگ صرف کھانے کی لذت کو جانتے ہیں۔ مگر اس سے بھی بڑی ایک لذت ہے اور وہ ذہنی تبادلۂ خیال (intellectual exchange) کی لذت ہے۔ اس لذت کو پانے کا سب سے بڑا ذریعہ آدمی کی بیوی ہوتی ہے جو اُس کی سب سے زیادہ قریبی ساتھی ہے اور ہر وقت اس کے لیے قابل حصول ہے۔

میں نے کہا کہ میں اس کو بھی ایک پیغمبرانہ سنت سمجھتا ہوں۔ آپ حدیث کی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہلیہ حضرت عائشہ کے اقوال پڑھیں تو حیرت ہوتی ہے کہ ایک خاتون نے اتنی گہری باتوں کو کیسے جان لیا۔ اس سے میں نے یہ سمجھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہ کے درمیان وہی چیز بار بار پیش آتی تھی جس کو میں انٹلکچول ایکسچینج کہہ رہا ہوں۔ چنانچہ ایک روایت کے مطابق، حضرت عائشہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے باتیں کرتے تھے۔ (کان یحدثنی) اس کا مزید فائدہ یہ ہے کہ اس سے خیالات زیادہ واضح ہوتے ہیں۔ نئی نئی باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ آدمی کے دماغ میں فکری عمل (thinking process) برابر جاری رہتا ہے جو مسلسل ذہنی ارتقاء کا ذریعہ بنتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ انٹلکچول ایکسچینج ہر لذیذ ڈش سے زیادہ لذیذ ہے — ولکن اکثر الناس لایعلمون (مگر اکثر لوگ اس کو نہیں جانتے)۔

۶ نومبر ۲۰۰۰ کو امریکا کا صدارتی الیکشن ہوا۔ ایک طرف جارج ڈبلیو بش تھے، دوسری طرف الگور تھے۔ جارج بش کے ووٹ صرف چند سو زیادہ تھے۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان وہی سیاسی جنگ شروع ہوگئی جو انڈیا اور پاکستان جیسے ملکوں میں نظر آتی ہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی اپنی ہار ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔

ٹھیک یہی معاملہ یہاں ۱۹۵۹ میں پیش آیا تھا۔ اس وقت رچرڈ نکسن (Richard Nixon) اور جان کینڈی (John Kennedy) کے درمیان مقابلہ تھا۔ نکسن کو چند سو ووٹ کم ملے تھے۔ نکسن کو یہ موقع تھا کہ وہ اپنی ہار نہ مانے۔ وہ قانونی نکتے نکال کر اپنے آپ کو فاتح ظاہر کرنے کی کوشش کرے۔ مگر نکسن نے یہ اعلان کر دیا کہ میں اپنے ملک کے مفاد اور اپنی پارٹی کے نام کے لیے ہار تسلیم کرتا ہوں:

I concede it for the sake of my country and my party.

کسی سیاسی نظام کی طاقت کا راز یہ ہے کہ اس کے لیڈر اپنی ہار ماننے کے لیے تیار ہوں۔ جہاں ایسا ہو کہ ہر لیڈر صرف اپنی جیت کا جھنڈا بلند کرنا چاہے وہاں کبھی مضبوط سیاسی نظام نہیں بن سکتا۔

امریکا میں سو سال سے ایک ادارہ قائم ہے۔ یہ ادارہ عیسائیوں اور یہودیوں نے قائم کیا تھا۔ چنانچہ پہلے اس کا نام یہ تھا:

National Conference for Christians & Jews

اس ادارہ کا مقصد مختلف مذہبی گروہوں کے درمیان میل ملاپ قائم کرنا ہے۔ اس کا موٹو یہ ہے:

We Open Minds.

بعد کو اس کے بانیوں کو خیال ہوا کہ اس ادارہ میں مسلمانوں کو بھی شامل کرنا چاہئے۔ چنانچہ اس کا نام بدل دیا گیا۔ اس کا موجودہ نام یہ ہے:

The National Conference for Community & Justice

اس تنظیم کی طرف سے ہر سال منتخب افراد کو ایوارڈ دیا جاتا ہے۔ اس کو خدمت انسانیت ایوارڈ (Humanitarian of the Year) کہا جاتا ہے۔ اس ادارہ کی طرف سے پچھلے سال ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی کو ایوارڈ دیا گیا تھا۔ اس سال جناب صفی قریشی صاحب کو یہ ایوارڈ دیا گیا ہے۔

۳۰ نومبر ۲۰۰۰ کو حیات ریجنسی (اِروین، کیلی فورنیا) میں اس کی تقریب منعقد کی گئی۔ یہاں شام کو ڈنر تھا جس میں ہر ایک کو ۲۰۰ ڈالر کا ٹکٹ لینا تھا اور اس کے بعد انعام دینے کا پروگرام تھا۔ صغیر اسلم صاحب وغیرہ کے ساتھ میں بھی اس فنکشن میں شریک ہوا۔ وہاں امریکی معیار کے مطابق، اعلیٰ درجہ کا تعیشاتی ماحول تھا۔ لوگ وہاں کے رنگا رنگ پروگرام میں خوب دلچسپی لے رہے تھے۔ قہقہے اور تالیوں کی گونج میں سارا پروگرام انجام پایا۔ مگر میں انتہائی بد دلی کے ساتھ اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ کھانا بھی میں نے بہت کم کھایا۔ اپنے احساسات کا ذکر کرتے ہوئے میں نے صغیر اسلم صاحب سے کہا:

For me it is a jungle of luxuries. I can not enjoy it.

یہاں بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ایک صاحب نے انڈیا کے بعض لیڈروں کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ مجھے حیوان سیاسی (political animal) دکھائی دیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کی بات درست ہے، مگر امریکا میں جو مسلمان آباد ہیں ان میں سے تقریباً ہر شخص مجھے حیوان کاسِب

(earning animal) دکھائی دیتا ہے۔ ان لوگوں کا واحد مقصد ڈالر کمانا ہے اور اپنے بچوں کا مستقبل بنانا ہے۔ میں ذاتی طور پر اس کو زندگی کا کوئی مقصد نہیں سمجھتا۔

اس فنکشن میں مردوں کے ساتھ خواتین بھی شریک تھیں۔ ایک خاتون کے شوہر نے مجھے ان سے ملایا۔ امریکا کے پچھلے سفر میں ان صاحب کے گھر پر مجھے کھانے کے لیے بلایا گیا تھا۔ وہاں ان کی بیگم نے بھی مجھ سے ملاقات کی تھی اور کچھ مسائل دریافت کیے تھے۔ میں نے خاتون سے کہا کہ اس سے پہلے آپ کے گھر پر آپ سے میری ملاقات ہو چکی ہے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے یاد نہیں۔ میرے بارے میں انہیں کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ مجھے یہ واقعہ بہت عجیب معلوم ہوا۔ اس واقعہ سے میں نے اندازہ کیا کہ ان مسلمانوں کے گھروں میں صرف دنیوی باتوں کا ماحول ہے۔ وہاں دین کا کوئی چرچا نہیں۔

ایک دینی عالم خواہ کسی بھی ملک سے آئے اور لوگوں کو اس کی بات سننے کا موقع ملے تو اس کے بعد گھروں میں اس کا چرچا ہونا چاہئے۔ اس کی باتوں پر ڈسکشن ہونا چاہئے۔ مگر یہاں کے گھروں میں اس قسم کا کوئی ماحول نہیں۔ یہاں کے گھروں میں سوشلائیزیشن (Socialization) کے چرچے ہیں۔ پارٹیاں کرنا اور پارٹیوں میں جانا ان کی دلچسپیوں کا موضوع بنا رہتا ہے۔ وہ ٹی وی اور مووی (movie) کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ فلمی ہیروؤں اور گیم کے کھلاڑیوں پر تبصرہ کرتے ہیں۔ کوئی دینی عالم ان کے نزدیک اس قابل نہیں کہ وہ ان کے گھر میں چرچا کا موضوع بنے۔

ہوٹل کے اس فنکشن میں اردن کے ایک اسکالر جناب ہیثم احمد بندقجی سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران ان سے میں نے پوچھا کہ کہا جاتا ہے کہ مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے اپنی ایک تقریر میں اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: نحن ابناء الفراعنة سنرميكم في البحر (ہم فرعونوں کی اولاد ہیں، ہم تم کو سمندر میں پھینک دیں گے) کیا یہ صحیح ہے۔

انہوں نے کہا کہ میں اپنے ذاتی علم کی بنا پر کہتا ہوں کہ یہ بالکل غلط ہے۔ انہوں نے بتایا کہ جمال عبدالناصر سے ایک امریکی صحافی نے پوچھا کہ کیا آپ نے ایسا کہا ہے۔ اس سوال کے جواب میں جمال عبدالناصر نے کہا کہ میں نے ایسی کوئی بات مطلق نہیں کہی۔ اگر اس قسم کی کوئی بات ثابت

ہو جائے تو اس کے بعد آپ جو بھی کہیں میں اس کو کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ہیثم احمد بندقجی نے مزید کہا کہ میں نے خود بھی جمال عبد الناصر سے اس کی بابت پوچھا تھا اور خدا گواہ ہے کہ میں نے خود بھی اپنے سوال کے جواب میں اُن سے یہ بات سنی ہے۔

امریکا میں دوسری قوم کے جو لوگ مثلاً ہندو یہاں آکر آباد ہوئے ہیں ان میں بہت سے لوگ ہیں جو اپنی قوم کی خدمت کے لیے طرح طرح کے کام کرتے رہتے ہیں۔ یہی حال مسلمانوں کا بھی ہے۔ یہاں کے مسلمانوں میں بہت سے لوگ ہیں جو مختلف قسم کے مسلم کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ مثلاً اسکول اور اسلامک سنٹر بنانا۔ سوشلا ئزیشن کا انتظام کرنا۔ قومی بہبود کی اسکیمیں چلانا۔ ہندستان، پاکستان اور بنگلہ دیش جیسے ملکوں کے مسلمانوں کی مالی مدد کرنا۔ قومی مصیبت کے مواقع پر ریلیف کا انتظام، کریکولم میں یا میڈیا میں مسلمانوں کے خلاف باتوں کو دریافت کرکے صحیح معلومات فراہم کرنا، وغیرہ۔

اس قسم کے کام کو کچھ لوگ اسلامی دعوت کہتے ہیں اور ایسے افراد کو اسلام کا داعی، مگر یہ درست نہیں۔ مذکورہ قسم کے کام بجائے خود مفید کام ہیں مگر ان کا اسلامی دعوت سے کوئی تعلق نہیں۔ ایسے افراد کے لیے میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ کمیونٹی ایکٹی وسٹ (community activist) ہیں۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

میں نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ دوسرے تمام سماجوں کی طرح امریکی سماج میں بہت سی خرابیاں ہیں۔ مثلاً نسلی تعصب، معاشی نابرابری، یہودی اکسپلائٹیشن، خارجہ پالیسی میں دہراپن، وغیرہ۔ بہت سے لوگ ان چیزوں کی وجہ سے امریکی نظام کے خلاف منفی جذبات اپنے سینہ میں لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ افراد جب اسلام قبول کرتے ہیں تو اسلام کے اسٹیج کو اپنے جذبات نفرت کے اظہار کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ مسلمان چونکہ خود بھی اسی قسم کے منفی جذبات میں مبتلا ہیں اس لیے وہ ان نومسلموں کی اصلاح نہیں کرپاتے۔ بلکہ وہ اپنی منفی باتوں سے ان کو اسلامی اور نظریاتی بنادیتے ہیں۔ اس طرح ان نو مسلم افراد کو فوراً ہی اپنے چھپے ہوئے خیالات کے اظہار کا ایک اسٹیج مل جاتا ہے۔ امریکا میں یا دوسرے

مغربی ملکوں میں یہ جو صورت حال ہے وہ میرے نزدیک بیک وقت دو برائیوں کا سبب بن رہی ہے۔ ایک یہ کہ نو مسلم افراد کی صحیح ذہنی تربیت نہیں ہو پاتی۔ اور دوسرے یہ کہ یہ لوگ اسلام کے صحیح مبلّغ نہیں بن پاتے۔ حالانکہ نو مسلم لوگ ہی ہر دور میں اسلام کے سب سے بڑے مبلّغ ثابت ہوئے ہیں۔

ایک صاحب نے بتایا کہ میں نے آپ کی اکثر کتابیں پڑھی ہیں اور زبانی طور پر آپ سے مجھے سننے کا موقع ملا ہے۔ میں نے پوچھا کہ پھر ہمارے مشن کے بارہ میں آپ کا تاثر کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میرا تاثر آپ اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ یہی سوال ایک اور شخص نے مجھ سے کیا تو میں نے ان کو یہ جواب دیا:

Maulana Sahab is an Islamic scholar who can interpret things in a modern way without slightest deviation from the Qur'an and Sunnah.

موجودہ زمانہ کا ایک عجیب ظاہرہ یہ ہے کہ بہت سے مسلمان ایسے کام کرتے ہیں جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے ملّی کام ہوتے ہیں مگر وہ اُس کو دعوہ کا نام دئے رہتے ہیں۔ کوئی مسلمانوں کو نماز روزہ سکھاتا ہے اور اس کو دعوت کا کام بتاتا ہے۔ کوئی مسلمانوں کی اقتصادی یا تعلیمی ترقی کے لیے کام کرتا ہے اور اس کو دعوت کا عنوان دئے ہوئے ہے۔ کوئی عوامی رابطہ کے لیے کچھ سرگرمیاں جاری کرتا ہے اور اس کو دعوت کا نام دے دیتا ہے۔ کوئی مسلمانوں کے ملّی تشخص کو محفوظ کرنے کے لیے تقریر و تحریر کا ہنگامہ برپا کرتا ہے اور اس کو دعوت قرار دینے لگتا ہے۔

اس قسم کے کام بجائے خود مفید ہو سکتے ہیں لیکن وہ ہرگز وہ کام نہیں جس کو قرآن میں دعوہ کہا گیا ہے۔ دعوت دراصل غیر مسلموں میں اسلام کا پیغام پہنچانے کا نام ہے۔ اس کام کی پہلی شرط یہ ہے کہ غیر مسلموں کے خلاف نفرت کے جذبات کو مکمل طور پر ختم کر دیا جائے۔ پھر اس کام کو ملّی کام سے بالکل الگ ایک کام کی حیثیت سے چلایا جائے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اس کو نظام کی دعوت کے طور پر نہیں بلکہ آخرت کی دعوت کے طور پر انجام دیا جائے۔

ایک برطانی نو مسلم حامد الگر نے کہا کہ بہت سے لوگ دعوت کے نام پر یہاں ایسے لٹریچر تقسیم

کرتے ہیں جن میں اسلام کو بہتر سیاسی اور اقتصادی نظام کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ انداز سراسر غیر موثر ہے۔ امریکا کا انسان تو یہ سمجھتا ہے کہ اس کے پاس جو اقتصادی اور سیاسی نظام ہے وہ مسلمانوں کے نظام سے بہت زیادہ بہتر ہے پھر اس قسم کا انداز ان کو کس طرح متاثر کرسکتا ہے۔

البتہ ایک اور مقام ہے جہاں مغربی انسان اپنے اندر کمی پاتا ہے۔ یہ روحانی خلا (spiritual vacuum) ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اسلام کی دعوت اس پر اثر انداز ہوسکتی ہے۔ اسلام کے داعیوں کو چاہیے کہ وہ اسلام کو روحانی انداز میں پیش کریں۔

میں نے کہا کہ یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ موجودہ زمانہ میں جو لوگ اس طرح اسلامی دعوہ کا کام کررہے ہیں وہ خود ہی روحانی اسلام سے خالی ہیں۔ وہ سیاسی باتوں کے سوا کسی اور بات کو جانتے ہی نہیں۔ روحانی انداز میں اسلام کو پیش کرنے کا کام وہی شخص کرسکتا ہے جس کو خود روحانیت کا رزق ملا ہو۔ روحانیت سے محروم لوگ اس کام کو کرنے کے اہل ہی نہیں۔

یہاں میں صغیر اسلم صاحب کے مکان پر مقیم تھا۔ میں اپنے ساتھ سفر میں ہمیشہ پیلو کی مسواک رکھتا ہوں۔ میں نے باتھ روم میں مسواک کی اور واش بیسن پر اس کو رکھ دیا۔ حالانکہ عام طور پر میں مسواک اپنی جیب میں رکھتا ہوں۔ صفائی کرنے والی خاتون آئی تو اس نے مسواک کو بے فائدہ قسم کا لکڑی کا ٹکڑا سمجھ کر اس کو کوڑے میں ڈال دیا۔ شام کو جب میں نے مسواک کرنا چاہا تو باتھ روم میں مسواک موجود نہ تھی۔

مسواک کو پھینکنا میرے لیے ایک پریشانی کی بات تھی۔ کیوں کہ یہاں عام طور پر برش کا رواج ہے اور میں برش نہیں کرپاتا۔ جو چیز میرے لیے نعمت تھی وہ صفائی کرنے والی خاتون کو کوڑا نظر آئی۔ یہ چھوٹا سا واقعہ بتاتا ہے کہ کس طرح ناواقفیت ایک صحیح کو غلط اور ایک درست کو نادرست سمجھ لیتی ہے۔

یکم دسمبر ۲۰۰۰ کو جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کی نماز اسلامک سوسائٹی آف آرنج کاؤنٹی کی مسجد میں پڑھی۔ یہ مسجد ایک چرچ کو خرید کر بنائی گئی ہے۔ مسلمان کبھی اپنی مسجد کو فروخت نہیں کرسکتے۔ خواہ کسی دوسرے مذہب کے عبادت خانے کے لیے ہو یا کسی اور کام کے لیے۔ مگر عیسائی لوگ اپنے غیر آباد

چرچ کو نہایت آسانی سے فروخت کر دیتے ہیں۔ اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ عیسائی لوگوں میں مذہبی اسپرٹ کی کمی ہے بلکہ یہ عبادت خانہ کے معاملہ میں تصور کا فرق ہے۔ مسیحی تصور کے مطابق زمین یا بلڈنگ کا نام چرچ نہیں ہے بلکہ اس تنظیم کا نام چرچ ہے جو عبادت کے لیے بنائی گئی ہو:

A body of Christians organized for worship and religious work.

اس تصور کے مطابق، کوئی چرچ اسی وقت تک چرچ ہے جب تک اس میں عبادتی تنظیم موجود ہو۔ جب وہاں عبادتی تنظیم باقی نہ رہے تو وہ بلڈنگ چرچ کی حیثیت کھو دیتی ہے۔ اس کے بعد وہ ایک عام بلڈنگ بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر آباد چرچ کو عیسائی لوگ نہایت آسانی سے فروخت کر دیتے ہیں۔

جمعہ کی اذان یہاں کے قاعدہ کے مطابق، مسجد کے اندر ہوئی۔ مسجد کی چھت کے اوپر لاؤڈ اسپیکر لگے ہوئے نہ تھے جو اذان کی آواز کو دور تک پہنچائیں۔ یہ ایک علامت ہے کہ کس طرح موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے دو قسم کا اسلام دریافت کر رکھا ہے۔ ہندستان اور پاکستان میں اگر مسجدوں کے اوپر سے لاؤڈ اسپیکر اتار دیے جائیں تو اسلام خطرے میں پڑ جائے گا مگر امریکا میں کسی مسجد کے اوپر کوئی لاؤڈ اسپیکر نہیں۔ اس کے باوجود یہاں اسلام اتنا زیادہ محفوظ ہے کہ ہندستان اور پاکستان اور دوسرے ملکوں کے مسلمان اس کے منتظر رہتے ہیں کہ کب انہیں موقع ملے اور بھاگ کر امریکا پہنچ جائیں۔

امریکا میں مقیم پاکستانی لوگ کئی اردو اخبار نکالتے ہیں۔ ان میں سے ایک ہفت روزہ اردو ٹائمز ہے جو نیویارک سے چھپتا ہے۔ اس کا شمارہ ۲۹ نومبر ۲۰۰۰ دیکھا۔ اس کے صفحہ ۲ پر دو مضامین چھپے تھے۔ ایک مضمون کا عنوان تھا: بھارت اپنا رویہ کبھی تبدیل نہیں کرے گا۔ دوسرے مضمون کا عنوان تھا: امت مسلمہ کو درپیش مسائل۔ میں نے اس کو پڑھا تو میرے دل نے کہا کہ امت مسلمہ کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنے ہر مسئلہ کے لیے کسی نہ کسی "بھارت" کو دریافت کیے ہوئے ہے۔ امت کے خود ساختہ نمائندے اپنی تحریر و تقریر سے امت کو مسلسل یہ یقین دلا رہے ہیں کہ تمہارے تمام مسائل کا

سبب فلاں فلاں خارجی لوگ ہیں اور وہ اتنے ہٹ دھرم ہیں کہ وہ اپنا رویہ بدلنے کے لیے تیار نہیں۔

یہی منفی رہنمائی امت کے تمام مسائل کی جڑ ہے۔ پوری امت کا ذہن یہ بنا دیا گیا ہے کہ تمہارے مسائل کا سبب تمہارے اندر نہیں ہے بلکہ تمہارے باہر ہے۔ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے اندر بیک وقت دو تباہ کن نفسیات پیدا ہوگئی ہے — اپنے بارے میں معصومانہ حد تک بے قصور ہونے کا احساس، اور دوسروں کے بارے میں مجرمانہ حد تک قصوروار ہونے کا احساس۔ اس نفسیات کا یہ مہلک نتیجہ ہوا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں حقیقت پسندی اور خود تعمیری کا مزاج ختم ہوگیا۔ جب کہ اسباب کی موجودہ دنیا میں حقیقت پسندی اور خود تعمیری کامیابی کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے۔

ایک امریکی پبلشنگ ہاؤس برجسٹون بکس (Bridgestone Books) نے ۲۴ صفحہ کی ایک کتاب ۱۹۹۶ میں چھاپی تھی جس کا نام مسلم ہولی ڈیز (Muslim Holidays) ہے۔ اس کے مصنف کا نام فیتھ ونچسٹر (Faith Winchester) ہے۔

اس کتاب میں ان تمام ''تیوہاروں'' کا ذکر ہے جو موجودہ مسلم سماج میں رواجی طور پر منائے جاتے ہیں۔ حالانکہ واقعی معنوں میں اسلامی تیوہار صرف دو ہیں۔ عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔

اس کتاب میں ایک پورے صفحہ پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خود ساختہ تصویر چھاپی گئی تھی۔ اس تصویر میں آپ کا جو چہرہ دکھایا گیا ہے وہ روحانی چہرہ کے بجائے جنگجو آدمی کا چہرہ نظر آتا ہے۔ اور آپ کے ہاتھ میں قرآن کے بجائے تلوار دکھائی دے رہی ہے۔ اس تصویر پر کونسل آن اسلامک ایجوکیشن نے اعتراض کیا۔ انہوں نے اس پر پبلشنگ ہاؤس سے خط و کتابت کی۔ آخر کار پبلشنگ ہاؤس اس صفحہ کو بدلنے پر راضی ہوگیا۔ چنانچہ کتاب کے اگلے ایڈیشن ۱۹۹۹ میں کتاب کے مذکورہ صفحہ پر تصویر کے بجائے جلی حرفوں میں صرف ''محمد رسول اللہ'' لکھا ہوا ہے۔

یکم دسمبر کی شام کو صغیر اسلم صاحب کے گھر پر اجتماعی افطار کا پروگرام تھا۔ اس میں کافی لوگ شریک ہوئے۔ افطار اور نماز کے بعد مجھ سے تقریر کے لیے کہا گیا۔ میں نے کہا کہ روزہ کے متعلق عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ صبح سے شام تک نہ کھایا جائے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ روزہ کا مقصد یہ ہے کہ اور

زیادہ کھایا جائے۔ یعنی مادی غذا کو کم کیا جائے تاکہ روحانی غذا زیادہ حاصل ہوسکے۔

قرآن میں دو چیزوں کو روزہ کا مقصد بتایا گیا ہے — تقویٰ اور شکر۔ روزہ رکھنے سے تقویٰ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور بھوک پیاس کے بعد شام کو جب آدمی کھاتا اور پیتا ہے تو اس کے اندر شکر کا جذبہ ابھرتا ہے۔ عام حالات میں آدمی جلد جلد کھاتا رہتا ہے۔ اس لیے اس کو نہ سچی بھوک کا تجربہ ہوتا ہے اور نہ اس بات کا تجربہ کہ کھانا کیسی عجیب نعمت ہے۔ میں نے بتایا کہ تاتاریوں نے جب عباسی سلطنت کو ختم کیا تو آخری سلطان کو ایک کمرہ میں قید کردیا۔ مسلسل کئی وقت اس کو کھانا نہیں ملا اور وہ بھوک سے تڑپنے لگا تو اس نے تاتاری سردار کے پاس پیغام بھیجا کہ میں بہت بھوکا ہوں، مجھے کھانے کے لیے کچھ بھیج دو۔ تاتاری سردار نے حکم دیا کہ محل کے تہہ خانے میں جو ہیرے اور جواہرات ملے ہیں ان کو ایک طشت میں سجا کر سلطان کے پاس لے جاؤ۔ سلطان نے جب طشت کو دیکھا تو وہ رو پڑا۔ اس نے روتے ہوئے کہا کہ: ان الجواھر لا تؤکل (ہیرے جواہر کھائے نہیں جاتے)۔

روزہ میں وقتی طور پر کھانا اور پینا بند کر کے آدمی کے اندر اس کیفیت کو بیدار کیا جاتا ہے کہ غذا کیسی عجیب نعمت ہے۔ دولت کی بڑی سے بڑی مقدار آدمی کے لیے غذا کا بدل نہیں بن سکتی۔

امریکا کے موجودہ سفر میں میرا قیام زیادہ تر صغیر اسلم صاحب کے گھر پر رہا۔ ان کی باتیں اور ان کے کام مجھے عام لوگوں کے مقابلہ میں بہت مختلف نظر آئے۔ ان میں ایک انوکھی صفت میں نے یہ پائی کہ ان کے خلاف اگر کوئی سخت بات کہی جائے یا ان پر تنقید کی جائے تو وہ اس پر ناراض نہیں ہوتے بلکہ نہایت معتدل انداز سے سنتے ہیں۔ ان کے اس مختلف مزاج کا راز کیا ہے، اس کا اندازہ مجھے ان کے ایک واقعہ سے ہوا۔

امریکی ریستوران میں یہ رواج ہے کہ ان کے ہاں ایک ڈاگی بیگ (Doggy Bag) ہوتا ہے۔ یعنی کتے کا پیکٹ۔ جو لوگ ریسٹورینٹ میں کھانے کے لیے آتے ہیں، جب ان کا کھانا بچ جاتا ہے تو ان کو یہ بیگ دیا جاتا ہے کہ اپنا کھانا اس میں رکھ لیں اور گھر جا کر اپنے کتے، بلی کو دے دیں تاکہ کھانا ضائع نہ ہو۔

تقریباً ۲۰ سال پہلے کا واقعہ ہے، صغیر اسلم صاحب نے نیویارک کے ایک ریسٹورینٹ میں کھانا کھایا۔ کھانا بچ گیا تو حسب قاعدہ ہوٹل کے ویٹر نے انہیں ایک خالی ڈاگی بیگ دیا اور کہا کہ اپنا بچا ہوا کھانا اس میں رکھ لیجئے اور واپس جا کر اپنے کتے کو کھلا دیجئے۔ صغیر اسلم صاحب نے کہا کہ یہ میرے لیے انسانی بیگ ہے نہ کہ ڈاگی بیگ۔ میں جا کر اس کو خود ہی کھاؤں گا۔

Please give me people bag, not doggy bag.

یہ واقعہ میں نے سنا تو فوراً میری زبان سے نکلا کہ آپ بلا شبہہ ایک بہادر آدمی ہیں۔ ایک بہادر آدمی ہی اس قسم کی بات کہہ سکتا ہے۔ اس کی بعد میری سمجھ میں آ گیا کہ صغیر اسلم صاحب کے اندر جو غیر معمولی صفات ہیں ان کا راز کیا ہے۔ ان کا راز یہ ہے کہ وہ ایک بہادر انسان ہیں۔ بزدل انسان بے برداشت انسان ہوتا ہے۔ وہ ہر بات کو اپنی عزت کا سوال بنا لیتا ہے۔ اس کے برعکس بہادر انسان برداشت والا انسان ہوتا ہے۔ وہ عزت اور بے عزتی کی اصطلاح میں نہیں سوچتا۔ وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ کوئی بات از روئے واقعہ کیا ہے، نہ یہ کہ اس کی شخصیت سے اس کا کیا تعلق ہے۔

۲ دسمبر کو ڈاکٹر حبیب اللہ صاحب مجھ کو اپنے مکان پر لے گئے۔ وہاں میں نے چند گھنٹے گزارے۔ ان کے رشتہ دار اور ان کے خاندان کے لوگ سو سے زیادہ کی تعداد میں یہاں قریب قریب رہتے ہیں۔ چنانچہ بہت سے لوگ ڈاکٹر حبیب اللہ صاحب کے مکان پر آ گئے۔ یہاں اجتماعی انداز میں لوگوں سے گفتگو ہوئی۔ ایک مسئلہ کی وضاحت کے دوران میں نے کہا کہ فریڈم بہت اچھی چیز ہے لیکن جب فریڈم انارکی کی حد تک پہنچ جائے تو وہ اتنی ہی زیادہ بُری چیز بن جاتی ہے۔

ظہر کی نماز ڈاکٹر حبیب اللہ صاحب کے مکان پر جماعت کی صورت میں پڑھی۔ نماز کے بعد میں نے انگریزی میں ایک مختصر تقریر کی جس میں نماز کی حقیقت بتائی۔ میں نے بتایا کہ نماز مسلمانوں کے لیے ایک مکمل تربیتی کورس ہے۔

۲ دسمبر کی شام کو اسلامک سوسائٹی کی مسجد میں افطار کا انتظام تھا۔ یہاں افطار سے پہلے ۱۵ منٹ کی ایک تقریر کی۔ اس تقریر میں روزہ کی حقیقت کے بارے میں میں نے کہا کہ حدیث میں رمضان

کے مہینہ کو صبر کا مہینہ کہا گیا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کی اصل حقیقت صبر ہے۔ روزہ اس بات کی تربیت ہے کہ آدمی تحمل اور برداشت کے ساتھ زندگی گزارے۔ وہ اخلاقی ڈسپلن کے ساتھ دنیا میں رہ سکے۔

یکم دسمبر کی شام کو صغیر اسلم صاحب کے گھر پر ایک اجتماع ہوا۔ اس اجتماع میں میں نے روزہ کے بارہ میں کچھ باتیں کہیں۔ میں نے کہا کہ آج کل لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ بالقصد سحری میں اتنا زیادہ کھاتے ہیں کہ شام تک انہیں بھوک نہ لگے۔ مگر یہ طریقہ روزہ کی اسپرٹ کے سراسر خلاف ہے۔ روزہ کا مقصد قرآن میں تقویٰ اور شکر بتایا گیا ہے۔

روزہ کے ضمن میں تقویٰ کا مطلب یہ ہے کہ صبح سے شام تک نہ کھانے کی وجہ سے آدمی کو بھوک کا تجربہ ہو اور پھر وہ احساس عجز کے ساتھ اللہ کی طرف تضرع کرے۔ وہ کھانے کی اہمیت کا تجربہ کرکے اللہ سے ڈرے کہ اگر وہ مجھ سے کھانا اور پینا چھین لے تو میرا کیا انجام ہوگا۔ شکر کا مطلب یہ ہے کہ شام کے وقت آدمی جب افطار کرے اور حدیث کے الفاظ میں اس کی رگیں پانی سے تر ہو جائیں تو اس کے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہو اور وہ سوچے کہ یہ اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے کہ اس نے میرے لیے رزق کا انتظام کیا۔ یہ بتاتے ہوئے میں نے کہا کہ لوگوں کو چاہئے کہ شام کے وقت پورا کھانا کھائیں مگر صبح کے وقت سحری میں ناشتہ کی مانند کم کھائیں تاکہ دن میں آپ کو بھوک کا تجربہ ہو۔

اس پر حاضرین میں سے ایک صاحب نے کسی قدر شدت کے ساتھ کہا کہ یہ بات درست نہیں۔ سحری میں اگر کم کھایا جائے گا تو دن میں آدمی کام کیسے کر سکے گا۔ میں ابھی خاموش تھا کہ حاضرین میں سے زیادہ عمر کے ایک صاحب نے کہا کہ میں لمبی مدت سے امریکا میں رہتا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ روزہ رکھنے والے مسلمان روزہ میں اتنا زیادہ کھاتے ہیں کہ ان کا وزن بڑھ جاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں آپ میں سے ہر شخص سے کہتا ہوں کہ وہ آج اپنے کو تول کر اپنا وزن لکھ لے اور پھر روزہ کے بعد وہ دوبارہ اپنے آپ کو تولے مجھے یقین ہے کہ وہ پائے گا کہ اس کا وزن روزہ کے بعد بڑھ گیا ہے۔

میں نے کہا کہ زیادہ کھانا (over eating) عام حالات میں بھی بری ہے۔ اور روزہ کے زمانہ میں زیادہ کھانا تو اور بھی زیادہ برا ہے۔ روزہ میں زیادہ کھانا اس مصلحت کو ختم کر دیتا ہے جس کے لیے رمضان کا روزہ فرض کیا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ روزہ کے بارے میں اسی قسم کی صورت حال تھی جس کے خلاف فارسی شاعر نے اس طرح احتجاج کیا تھا کہ روزہ کی ریاضت نے لوگوں کی تن پروری کو اور زیادہ بڑھا دیا ہے۔ چنانچہ رمضان کا مہینہ سحری اور افطار کی دھوم کا مہینہ بن گیا ہے:

تن پروری خلق فزوں شد ز ریاضت　　　جز گرمیٔ افطار ندارد رمضان ہیچ

جناب صغیر اسلم صاحب کے ساتھ کئی دنوں تک رہنے کے بعد میں نے اندازہ کیا کہ وہ غیر معمولی صفات کے آدمی ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے عام انسانوں سے مختلف صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ ۴ دسمبر ۲۰۰۰ کی صبح کو میں نے ان سے کہا:

God Almighty created you with special qualities. But He is still waiting for you to play a role which is equal to that special creation.

تاریخ بتاتی ہے کہ ہر دور میں اللہ تعالیٰ نے کچھ بہت غیر معمولی صلاحیت والے انسان پیدا کیے۔ مگر ان میں بہت کم ایسے انسان تھے جنہوں نے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کو حقیقی معنوں میں کسی اعلیٰ مقصد کے لیے استعمال کیا۔ تاریخ کے بیشتر اعلیٰ افراد اپنی صلاحیتوں کا صرف کمتر استعمال کرتے رہے، یہاں تک کہ وہ مر کر اس دنیا سے چلے گئے۔

صغیر اسلم صاحب کی اہلیہ بشریٰ سلطانہ (عمر ۴۵ سال) پاکستان میں پیدا ہوئیں اور ۱۹۷۲ سے امریکا میں رہ رہی ہیں۔ میں یہاں کئی بار آیا ہوں اور ان کے گھر پر کئی کئی دن تک ٹھہرا ہوں۔ وہ ایک خوش حال فیملی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور اچھی انگریزی بولتی ہیں اور امریکا کی شہری بن چکی ہیں۔ مگر میں نے ان کے اندر ذرا بھی امریکی پن کا تجربہ نہیں کیا۔ ان کے اندر چار صفتیں نہایت عجیب ہیں — خالص دینی مزاج، خدمت خلق کا گہرا جذبہ، انتہائی سادگی، نو پرابلم خاتون بن کر رہنا۔

ان کی والدہ مرحومہ نے ان کو ایک نصیحت کی تھی، وہ یہ کہ کسی کو تم سے شکایت ہو تو تم کبھی اپنی

طرف سے صفائی مت پیش کرنا، تم نے غلطی نہ کی ہو تب بھی کہنا کہ مجھے معاف کیجئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ نصیحت ایک کلیدی نصیحت ہے۔ اور ہر عورت اور ہر مرد کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ خاندانی یا سماجی زندگی میں بیشتر مسئلے اسی لیے پیدا ہوتے ہیں کہ لوگ شکایت کے موقع پر صفائی پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ صفائی پیش کرنا عملی طور پر بالکل بے فائدہ ہے۔ اجتماعی زندگی کا واحد کامیاب فارمولا یہ ہے کہ اگر آپ نے کوئی غلطی کی ہے تو جب آپ کو غلطی کی طرف متوجہ کیا جائے تو آپ فوراً اپنی غلطی مان کر اس کی اصلاح کرلیں اور اگر آپ نے غلطی نہیں کی ہے تب بھی یہی کہیں کہ میری غلطی کے لیے مجھ کو معاف کیجئے۔ آپ کا اعتماد اس پر ہونا چاہئے کہ میں غلطی سے بری ہوں نہ کہ اس پر کہ میں نے اعتراض کرنے والے کے اعتراض کا جواب دے دیا ہے۔

جناب عمران احمد چودھری (پیدائش ۱۹۷۷) ایک کمپیوٹر انجینئر ہیں۔ وہ ۱۹۹۶ میں پاکستان سے امریکا آئے۔ ان سے میں نے پوچھا کہ آپ اپنی زندگی کا کوئی تجربہ بتائیے۔ انہوں نے کہا کہ اگر آپ اپنے ماحول میں کسی وجہ سے غیر آسودہ (uncomfortable) ہیں تو اس کو اپنے لیے کوئی برائی نہ سمجھئے۔ اگر آپ غیر آسودگی کے ساتھ رہنا سیکھ لیں تو غیر آسودگی آپ کے لیے نعمت (boon) بن جائے گی۔

انہوں نے کہا کہ میں یہاں ایک کمپیوٹر کمپنی میں ٹکنیشین کے طور پر کام کررہا تھا۔ میرا کام چھوٹے کمپیوٹر (Lap Top) کو ریپیئر کرنا اور بیچنا تھا۔ میرا مینیجر جو ایک وہائٹ امریکن تھا، کسی وجہ سے اس کو مجھ سے ضد ہوگئی۔ وہ میری سخت نگرانی کرنے لگا۔ حتی کہ وہ یہ بھی دیکھنے لگا کہ میں باتھ روم میں کتنے منٹ صرف کرتا ہوں۔ جب کہ اسی آفس میں جو دوسرے ٹکنیشین تھے ان کے ساتھ اس کا رویہ رعایت کا تھا۔

انہوں نے کہا کہ اب ایک صورت یہ تھی کہ میں مینیجر کے متعصبانہ سلوک پر غصہ کروں اور اپنے دل میں اس شکایت کی پرورش کروں کہ وہ میرے ساتھ ایک سلوک کرتا ہے اور دوسروں کے ساتھ کچھ اور سلوک تو اس کا انجام یہ ہوتا کہ یا تو میں لڑتا جھگڑتا رہتا یا کمپنی کو چھوڑ کر چلا جاتا۔ دونوں حالتوں میں میرا ہی نقصان تھا۔ اس کے برعکس میں نے یہ کیا کہ مینیجر کے نازیبا سلوک کو نظرانداز کرتے ہوئے میں

اپنے کام میں لگا رہا۔ مینیجر کی سخت گیری کو گوارا کرنے کا مزید فائدہ یہ ہوا کہ میں اپنے کام میں اور زیادہ چوکس ہو گیا تا کہ اس کو میرے خلاف شکایت کا موقع نہ ملے۔

انہوں نے بتایا کہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے لوگ جس کام کو تقریباً ۲ سال میں سیکھتے ہیں اس کو میں نے صرف چھ ماہ میں سیکھ لیا۔ اور اب میں دوسری کمپنی میں زیادہ بہتر جاب کر رہا ہوں۔

۴ دسمبر کو جناب رفیع صاحب کے ہمراہ یہاں کی مختلف چیزیں دیکھیں۔ ان میں سے ایک وہ عالی شان چرچ تھا جسے کرسٹل کیتھیڈرل کہا جاتا ہے۔ وہ ایک عبادت خانہ کے طور پر بنایا گیا ہے مگر وہ اپنی وسعت اور چمک دمک کے اعتبار سے ایک بہت بڑا شوپیس دکھائی دیتا ہے۔ عبادت خانہ کا یہ نمائشی تصور بڑا عجیب معلوم ہوتا ہے۔ مگر عیسائی حضرات کے یہاں صدیوں سے یہ چلا آرہا ہے کہ چرچ کو اتنا عالی شان بناؤ کہ اس کی عمارت کو دیکھ کر لوگ ہمارے مذہب کی عظمت کو محسوس کریں۔ امریکا کا یہ کرسٹل کیتھیڈرل اس تصور کی ایک انوکھی مثال ہے۔ اس کیتھیڈرل میں آنے والا شخص انسانی کاریگری کی وقتی عظمت سے اتنا زیادہ مسحور ہوتا ہے کہ اس کو خدا کی حقیقی اور ابدی عظمت کا سرے سے خیال ہی نہیں آتا۔

چرچ کے وسیع احاطہ میں پختہ راستے (path ways) بنے ہوئے ہیں۔ ان پر بائبل کے اقتباسات قیمتی پتھروں پر کندہ کرکے راستہ میں نصب کئے گئے ہیں۔ ان میں سے اکثر اقتباسات میں خدا (God) کا لفظ بھی شامل تھا۔ مثال کے طور پر:

I will dwell in the House of the Lord forever.

God has spoken to us by His son.

ان پتھروں پر لوگ جوتا پہنے ہوئے اطمینان کے ساتھ چل رہے تھے۔ یہ بھی عیسائیت کا انوکھا مزاج ہے۔

ڈاکٹر حبیب اللہ خاں صاحب کی بیگم، شمیم حبیب اللہ نے اپنے مکان پر ایک اجتماع کیا جس میں ان کے وسیع خاندان کے عورت اور مرد شریک ہوئے۔ ۴ دسمبر کو میں نے اس میں شرکت کی۔ سوال و جواب کی صورت میں دیر تک اسلام کے مختلف پہلوؤں پر بات ہوتی رہی۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ عورت اور مرد کے درمیان اسلام میں کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں عورت اور مرد دونوں کو ایک دوسرے کا شقیقہ کہا گیا ہے، یعنی ایک کُل کے دو برابر نصف حصے۔ مگر برابری کے ساتھ زندگی میں ایڈجسٹمنٹ کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایڈجسٹمنٹ عورت اور مرد کے درمیان ہی نہیں بلکہ عورت اور عورت، مرد اور مرد کے درمیان بھی ضروری ہے۔ اگر ایڈجسٹمنٹ نہ کیا جائے تو زندگی گزارنا ہی ممکن نہ رہے گا۔

ایک مجلس میں کچھ تعلیم یافتہ لوگوں کے درمیان یہ گفتگو ہوئی کہ صاحب بصیرت انسان (man of vision) کون ہے۔ میں نے کہا کہ صاحب بصیرت انسان وہ ہے جس کی بصیرت کی مستقبل تصدیق کرے۔ جس کی بصیرت کی مستقبل کے حالات تصدیق نہ کریں وہ ایک خواب دیکھنے والا (dreamer) تھا نہ کہ حقیقی معنوں میں صاحب بصیرت انسان۔

میں نے کہا کہ بدقسمتی سے موجودہ زمانہ میں برصغیر کے اکثر مقبول لیڈر صرف ڈریمر ثابت ہوئے ہیں۔ پاکستان کے اقبال اور جناح اور ہندستان کے گاندھی اور نہرو سب اس کی مثالیں ہیں۔

پاکستان سے آئے ہوئے ایک مسلمان نے بتایا کہ چالیس سال پہلے وہ امریکا میں آئے۔ اس وقت وہ نوجوان تھے۔ ایک دن وہ اپنے مقامی ساتھی کے ہمراہ ایک سڑک سے گزرے۔ ایک مقام پر اس سڑک کے کنارے ایک خوبصورت عمارت تھی۔ اس کے سامنے بہت بڑا سرسبز اور خوب صورت لان تھا۔ اس میں ہرے بھرے درخت اور پھولوں کے دلکش مناظر تھے۔ انہوں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ جب میں پیسہ کمالوں گا تو امریکا میں اسی قسم کا ایک مکان اپنے لیے خریدوں گا۔ ان کے ساتھی نے کہا کہ اس کو تمہیں خریدنا نہیں پڑے گا۔ وہ تو تم کو خریدے بغیر ہی مل جائے گا۔ انہوں نے پوچھا کہ وہ کیسے۔ ساتھی نے کہا کہ یہ تو یہاں کا قبرستان ہے۔ اس قبرستان کا نام روز گارڈن ہے۔

۳ دسمبر ۲۰۰۰ کو مجھے بھی یہاں کا ایک قبرستان دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس قبرستان کا نام ملروز ایبے (Melrose Abbey) تھا۔ میں جب وہاں پہنچا تو یہ میرے لیے ایک نیا مشاہدہ تھا۔ یہ ایک نہایت وسیع پارک کی مانند تھا۔ اس کے اندر عمدہ سڑکیں بنی ہوئی تھیں۔ ایک کنارے ایک شاندار

عمارت کھڑی ہوئی تھی۔ مگر وہ کوئی محل نہ تھا بلکہ وہ عمودی (vertical) قبرستان تھا۔ یہ قبرستان دیکھنے میں ایک اعلیٰ درجہ کی تفریح گاہ معلوم ہوتا تھا۔ اتوار کا دن تھا۔ چنانچہ کئی لوگ کاروں پر سفر کرکے یہاں آئے تھے تاکہ مرے ہوئے عزیزوں کی یاد تازہ کرسکیں۔ یہاں موت کے سناٹے کے بجائے زندگی کی تازگی دکھائی دے رہی تھی۔

میں نے سوچا کہ پہلے قبرستان کا تصور یہ تھا کہ وہاں کے ماحول میں موت اور دنیا کی ناپائداری یاد آتی تھی۔ مگر امریکا کے قبرستان میں تو قبرستان بھی ایک راحت کدہ بن گیا ہے۔ لکھنؤ میں قبرستان کا نام عیش باغ ہے۔ مگر حقیقت میں یہ امریکا ہے جہاں قبرستان کو عیش باغ کی صورت دے دی گئی ہے۔

ایک مجلس میں میں نے کہا کہ کام کی دو قسمیں ہیں۔ کمیونٹی ورک اور دعوہ ورک۔ کمیونٹی ورک وہ ہے جو کمیونٹی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے وجود میں آئے۔ اور دعوہ ورک وہ ہے جو خالص اللہ کی مرضی کو پورا کرنے کے لیے شروع کیا گیا ہو۔ دونوں کے فرق کو ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ قدیم مکہ میں دعوہ ورک تو پوری طرح ممکن تھا چنانچہ دور اول کے صحابہ رات دن اس میں مصروف رہتے تھے مگر وہاں کمیونٹی ورک کا کوئی امکان نہ تھا۔ کیوں کہ کمیونٹی ابھی وجود ہی میں نہ آئی تھی۔

موجودہ زمانہ میں کمیونٹی ورک نہایت اعلیٰ پیمانہ پر کرنا ممکن ہوگیا ہے۔ آج مسلمان ایک بلین سے زیادہ تعداد میں ہیں۔ ان کے پاس ہر قسم کے وسائل وافر مقدار میں موجود ہیں۔ وہ دنیا کے تقریباً ہر ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کو ایک عظیم انسانی مارکیٹ بنا دیا ہے۔ آج ان کے درمیان جو کام بھی کیا جائے اس میں شہرت، لیڈری، مادی منافع اور عوامی مقبولیت فوراً مل جائے گی۔ اس بنا پر آج یہ ممکن ہوگیا ہے کہ اس عظیم مسلم ملت کے درمیان جو بھی کمیونٹی ورک کیا جائے وہ کامیابی کا زینہ بن جائے گا۔

میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کے نام پر جو بے شمار کام ہو رہے ہیں وہ زیادہ تر کمیونٹی ورک ہیں نہ کہ دعوہ ورک۔

کمیونٹی ورک اور دعوہ ورک کا فرق بے حد بنیادی فرق ہے۔ اس فرق کو خود اسلام کی تاریخ سے سمجھا جاسکتا ہے۔ قدیم مکہ میں نبوت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ سال تک مقیم رہے۔ اس وقت دعوہ ورک اپنی کامل تربیتی صورت میں جاری تھا۔ اسی دعوہ ورک کے نتیجہ میں اکثر بڑے بڑے صحابہ حاصل ہوئے۔ مگر اس وقت کے مکہ میں کمیونٹی ورک سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ جب کہ موجودہ دور کے مسلمانوں میں کمیونٹی ورک بہت بڑے پیمانہ پر جاری ہے۔ بلکہ موجودہ زمانہ میں اسلام کے نام پر جو کام مسلمانوں کے درمیان ہو رہے ہیں وہ تقریباً سب کے سب اپنی نوعیت کے اعتبار سے کمیونٹی ورک ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ دعوت ورک تو ہر حال میں ہوتا ہے۔ حتی کہ اس وقت بھی جب کہ ساری دنیا میں صرف ایک مسلمان موجود ہو۔ مگر کمیونٹی ورک اس وقت ہوتا ہے جب کہ خود کمیونٹی وجود میں آچکی ہو۔ جتنی بڑی کمیونٹی اتنا ہی بڑا کمیونٹی ورک۔

موجودہ زمانہ میں ایک بلین سے زیادہ مسلمان ہیں۔ ان کے پاس ہر قسم کے اقتصادی وسائل وافر مقدار میں موجود ہیں۔ قدیم مکہ میں کوئی مسجد یا مدرسہ بنانا ہی ناممکن تھا۔ آج جب ایک شخص مسجد اور مدرسہ بنانے کی مہم چلاتا ہے تو اس کو ملین اور بلین ڈالر کا تعاون حاصل ہو جاتا ہے۔

اس فرق سے مزید یہ معلوم ہوا کہ دعوہ ورک صرف اللہ کی رضا ہی کے لیے کرنا ممکن ہوتا ہے۔ جب کہ کمیونٹی ورک ایک ایسا کام ہے جس میں ہر قسم کے دنیوی اور مادی فائدے اعلیٰ پیمانہ پر شامل ہو جاتے ہیں۔ اس میں لیڈری بھی شامل ہے اور مقبولیت بھی اور اقتصادی فائدے بھی۔

کمیونٹی ورک عام حالات میں صرف قومی ورک ہوتا ہے، اس کو لوگ قوم کے عنوان سے کرنے کے بجائے اسلام کے نام پر اس لئے کرتے ہیں کہ لوگوں کا تعاون زیادہ سے زیادہ حاصل ہو۔

۵ دسمبر ۲۰۰۰ کو واپسی تھی۔ ساڑھے چار بجے دن میں جناب صغیر اسلم صاحب کے ساتھ روانہ ہو کر لاس اینجلیز ایر پورٹ پہنچا۔ یہاں کی معمول کی کارروائی میں کچھ وقت گزرا۔ میرے ٹکٹ پر مسلم میل لکھوادیا گیا تھا جو عام طور پر یہودی ذبیحہ کوشر (kosher) پر مشتمل ہوتا ہے جو میرے ذوق کے

مطابق نہیں۔ میں نے اسے بدلوا کر ایشین وجیٹیرین لکھوایا۔ میرا یہ سفر جرمن ایرلائن لفتھانزا کے ذریعہ ہوا۔ میرے تجربہ کے مطابق جرمن لوگ کسی قدر غیر نرم ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں سوئس ایر کے لوگ مجھے زیادہ نرم اور متواضع دکھائی دیے۔

لاس اینجلیز سے لفتھانزا کی فلائٹ سے فرینک فرٹ کے لیے روانگی ہوئی۔ یہ تقریباً ساڑھے دس گھنٹے کا نان اسٹاپ سفر تھا۔ مگر راستہ میں نیند آگئی جس نے سفر کو آسان کر دیا۔ نیند ایک عجیب نعمت ہے جو طویل مدت کو مختصر کر دیتی ہے۔

فرینک فرٹ میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے انتظار کرنے کے بعد دہلی کے لیے روانگی ہوئی۔ اب ۶ دسمبر کی صبح کا وقت ہو چکا تھا۔ فرینک فرٹ سے دہلی کا سفر دوبارہ لفتھانزا کے جہاز سے ہوا۔ یہ سفر تقریباً آٹھ گھنٹے کا تھا۔ دوبارہ یہ سفر بھی زیادہ تر نیند کی حالت میں ہوا۔ اس پورے سفر میں کھانے اور نماز کے علاوہ زیادہ تر وقت سوتے ہوئے گزرا۔ جہاز اپنے وقت پر دہلی پہنچ گیا۔ یہ شمسی کیلنڈر کے لحاظ سے ۷ دسمبر کو صبح ڈیڑھ بجے کا وقت تھا، یعنی ۶ دسمبر کا دن گزار کر رات کو ڈیڑھ بجے۔ ہندستان سے امریکا جاتے ہوئے تاریخ دیر میں بدلتی ہے اور واپسی میں تیزی سے بدل جاتی ہے۔

دہلی ائر پورٹ پر چلتے ہوئے وہاں پہنچا جہاں پاسپورٹ کی چکنگ ہوتی ہے۔ میرا پاسپورٹ میرے ساتھی کے ہاتھ میں تھا۔ چیک کرنے والے شخص نے ان سے میرا پاسپورٹ لیا اور اس کو کھول کر دیکھنے کے بعد کہا: کیا یہ وہی مولانا صاحب ہیں جو لیکھ لکھتے ہیں۔ میرے ساتھی نے کہا کہ ہاں۔ پھر اس نے کہا کہ اچھا جائیے اور ہم بلا روک ٹوک چلتے ہوئے باہر آگئے۔

ماہنامہ الرسالہ کا ہندی اور انگریزی ایڈیشن

ماہنامہ الرسالہ کا ہندی اور انگریزی ایڈیشن بمبئی سے شائع ہورہا ہے۔ ہندی ایڈیشن کا نام الرسالہ (अल-रिसाला) ہے اور انگریزی ایڈیشن کا نام اسپریچول میسیج (Spiritual Message) ہے۔ دونوں کی تفصیل یہ ہے:

ہندی الرسالہ فی کاپی -/10 روپے، سالانہ -/110 روپے۔

اسپریچول میسیج، فی کاپی -/15 روپے، سالانہ -/165 روپے۔

دونوں کا پتہ یہ ہے:

Al-Risala (Hindi) Monthly
E-4, Marian House, 29th, Road, T.P.S. III
Opp.Waterfield Road, Bandra (W), Mumbai- 400 050
Tel.: 2834 1654/ 2834 6079/ 2821 8609 Fax : 2823 6323
E-mail: hbshaikh@bom5.vsnl.net.in

Manager Spritual Message
Published and edited by Haroon B. Shaikh
302, Koldongri CHS, Sahar Road
Andheri (East), Mumbai-400 099 (India)
Tel.: 2834 1654/ 28346079/.2821 8609, Fax: 2823 6323
Email: hbshaikh@bom5.vsnl.net.in

حیدرآباد میں مولانا وحیدالدین خاں کی عصری اسلوب میں فکر انگیز اسلامی کتابیں اور ماہنامہ الرسالہ حسب ذیل پتوں پر دستیاب ہیں۔ ٹیلی فون پر آرڈر دے کر بھی کتابیں منگوائی جاسکتی ہیں:

مولانا اکبرالدین قاسمی
مکان نمبر 18-7-198/A/275/A
نیو مغل پورہ، حیدرآباد 500264
Tel. 24562514

حافظ عبدالغفار صاحب
مکان 16-8-663 (بی کلاس 168)
فٹبال گراؤنڈ، جدید ملک پیٹھ
حیدرآباد 500036
موبائل: 9440057526

ORDER FORM

Al-Risāla 1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 24355454, 24351128
Fax: 2435 7333, e-mail: skhan@vsnl.com, website: www.alrisala.org

QUANTITY	PRICE	TITLES	QUANTITY	PRICE	TITLES	QUANTITY	PRICE	TITLES
	60.00	دین انسانیت		8.00	اسلام: ایک عظیم جدوجہد		400.00	تذکیر القرآن (مکمل مجلد)
	50.00	فکر اسلامی		8.00	تاریخ دعوت حق		250.00	تذکیر القرآن (پیپر بیک)
	50.00	شتم رسول کا مسئلہ		12.00	مطالعہ سیرت (کتابچہ)		85.00	اسباق تاریخ
	8.00	طلاق اسلام میں		80.00	ڈائری (جلد اول)		60.00	تعمیر حیات
	60.00	مضامین اسلام		65.00	کتاب زندگی		50.00	تعمیر انسانیت
	10.00	حیات طیبہ		25.00	اقوال حکمت		125.00	سفرنامہ غیرملکی اسفار جلد اول
	10.00	باغ جنت		10.00	تعمیر کی طرف		125.00	سفرنامہ غیرملکی اسفار، جلد دوم
	10.00	نار جہنم		20.00	تبلیغی تحریک		80.00	اسلام: ایک تعارف
	10.00	سچا راستہ		25.00	تجدید دین		60.00	اللہ اکبر
	10.00	دینی تعلیم		35.00	عقلیات اسلام		50.00	پیغمبر انقلاب
	10.00	خلیج ڈائری		25.00	قرآن کا مطلوب انسان		65.00	مذہب اور جدید چیلنج
	10.00	رہنمائے حیات		10.00	دین کیا ہے؟		35.00	عظمت قرآن
	10.00	تعدد ازدواج		20.00	اسلام دین فطرت		60.00	عظمت اسلام
	60.00	ہندستانی مسلمان		10.00	تعمیر ملت		10.00	عظمت صحابہ
	10.00	روشن مستقبل		10.00	تاریخ کا سبق		80.00	دین کامل
	10.00	صوم رمضان		8.00	فسادات کا مسئلہ		45.00	الاسلام
	8.00	اسلام کا تعارف		8.00	انسان اپنے آپ کو پہچان		50.00	ظہور اسلام
	20.00	علما اور دور جدید		8.00	تعارف اسلام		40.00	اسلامی زندگی
	60.00	سفرنامہ اسپین و فلسطین		8.00	اسلام پندرہویں صدی میں		35.00	احیاء اسلام
	12.00	مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے		12.00	راہیں بند نہیں		65.00	راز حیات
	10.00	سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ		10.00	ایمانی طاقت		40.00	صراط مستقیم
	10.00	یکساں سول کوڈ		10.00	اتحاد ملت		60.00	خاتون اسلام
	10.00	اسلام کیا ہے؟		20.00	سبق آموز واقعات		50.00	سوشلزم اور اسلام
	40.00	میوات کا سفر		10.00	زلزلہ قیامت		30.00	اسلام اور عصر حاضر
	35.00	قیادت نامہ		12.00	حقیقت کی تلاش		40.00	الربانیہ
	8.00	منزل کی طرف		8.00	پیغمبر اسلام		45.00	کاروان ملت
	125.00	اسفار ہند		10.00	آخری سفر		30.00	حقیقت حج
	100.00	ڈائری ۹۰-۱۹۸۹		10.00	اسلامی دعوت		35.00	اسلامی تعلیمات
	70.00	قال اللہ و قال الرسول		20.00	حل یہاں ہے		25.00	اسلام دور جدید کا خالق
	90.00	ڈائری ۹۲-۱۹۹۱		25.00	امہات المومنین		40.00	حدیث رسول
	80.00	مطالعہ قرآن		85.00	تصویر ملت		35.00	راہ عمل
	40.00	مذہب اور سائنس		50.00	دعوت اسلام		80.00	تعبیر کی غلطی
	100.00	دین و شریعت		40.00	دعوت حق		25.00	دین کی سیاسی تعبیر
	60.00	مطالعہ سیرت		80.00	نثری تقریریں		10.00	عظمت مومن

RNI 28822/76 • U(SE) 12/2003
Delhi Postal Regd. No. DL/11154/2003































